جلوۂ ایثار

ایک ناول

پریم چند

قیمت ...... چار روپے

پبلشرز کتاب منزل لاہور

اتحاد پریس مل روڈ لاہور

وندھیاچل پہاڑ آدھی رات کی ڈراؤنی تاریکی میں کالے دیو کی طرح کھڑا تھا۔ اس پر اُگے ہوئے چھوٹے چھوٹے درخت ایسے نظر آتے تھے گویا اسکی جٹائیں ہیں اور آشٹ بھجی دیوی کا مندر جس کے کلس پر سیاہ پتاکے ہوا کے دھیمے دھیمے جھونکوں سے لہرا رہے تھے اس دیو کا سر معلوم ہوتا تھا۔ مندر میں ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ نظر آتا تھا جس پر کسی دھندلے تارے کا گمان ہوتا تھا۔

آدھی رات گذر چکی تھی۔ چاروں طرف ہیبتناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گنگا جی کی سیاہ لہریں پہاڑ کے نیچے سکون بخش روانی کے ساتھ بہہ رہی تھیں اور اُن کے بہاؤ سے ایک دلآویز نغمہ کی صدا نکل رہی تھی۔ جا بجا کشتیوں پر اور کناروں کے آس پاس ملاحوں کے چولھوں کی آنچ نظر آجاتی تھی۔ ایسے وقت میں ایک سفید پوش عورت آشٹ بھجی دیوی کے سامنے ہاتھ باندھے بیٹھی ہوئی تھی اُس کا متین چہرہ زرد تھا۔ اور بشرے سے شرافت برس رہی تھی۔ اُس نے دیر تک سر جھکائے رہنے کے بعد کہا:۔

"ماتا! آج بیس سال سے کوئی منگل کا دن ایسا نہیں گذرا کہ میں نے تمہارے چرنوں پر سر نہ جھکایا ہو۔ ایک دن بھی ایسا نہیں گذرا کہ میں نے

تمہارے چرنوں کا دھیان نہ کیا ہو۔ تم جگ تارنی مہارانی ہو مگر تمہاری اتنی سیوا کرنے پر بھی میرے دل کی آرزو پوری نہ ہوئی۔ میں تمہیں چھوڑ کر اب کہاں جاؤں۔
ماتا! میں نے سینکڑوں برت رکھے دیوتاؤں کی اپاسنائیں کیں۔ تیرتھ جاترائیں کیں مگر منورتھ نہ پورا ہوا تب تمہارے سرن آئی۔ اب تمہیں چھوڑ کر کہاں جاؤں تم نے سدا اپنے بھگتوں کی مرادیں پوری کی ہیں۔ کیا میں تمہارے دربار سے نراش جاؤں۔

سُبھاما اسی طرح دیر تک بنتی کرتی رہی۔ یکایک اُس کے دل پر بیخبر کر دینے والی محویت کا غلبہ ہوا۔ اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور کان میں آواز آئی:-

"سبھاما! میں تجھ سے بہت خوش ہوئی۔ مانگ، کیا مانگتی ہے۔"

سبھاما کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور کلیجہ دھڑکنے لگا۔ آج بیس سال کے بعد مہارانی نے درشن دئے۔ کانپتے ہوئے بولی۔" جو کچھ مانگوں گی وہ مہارانی دینگی؟"

"ہاں ملے گا!"

"میں نے بڑی تپسیا کی ہے اس لئے بڑا بھاری بردان مانگونگی۔"

"کیا لیگی؟ کبیر کا دھن"؟

"نہیں"

"اندر کا بل"

"نہیں"۔

۵

"سرسوتی کی وِدیا"؟

"نہیں"!

"سنسار کا سب سے اُتّم پدارتھ!"

"وہ کیا ہے؟"

"سپوت بیٹا"

"جو کُل کا نام روشن کرے؟"

"نہیں"

"جو ماں باپ کی سیوا کرے؟"

"نہیں"

"جو وِدیا وان اور بلوان ہو؟"

"نہیں"

"پھر سپوت بیٹا کسے کہتی ہے؟"

"جو اپنے دیس کا اُپکار کرے"!

"تیری بُدھی کو دھنیہ ہے۔ جا تیری اچھّا پُوری ہوگی"!

ویراگ

منشی سالگ رام بنارس کے پُرانے رئیس تھے۔ پیشہ وکالت تھا اور موروثی
جائداد وافر۔ دساسمیدھ گھاٹ پر ان کا عالیشان مکان آسمان سے باتیں کرتا تھا
فیاض ایسے کہ پچیس تیس ہزار کی آمدنی خرچ کو کافی نہ ہوتی۔ سادھوؤں اور برہمنوں کے
پکے معتقد۔ جو کچھ کماتے برہم بھوج اور سادھوؤں کی تواضع و تکریم میں صرف ہو جاتا
شہر میں کوئی سادھو۔ کوئی مہاتما آجائے وہ منشی جی کا مہمان تھا۔ سنسکرت کے
ایسے عالم کہ بڑے بڑے پنڈت اُنکا لوہا مانتے۔ ویدانت کے اصولوں کے پابند تھے اور
طبیعت کا میلان ویراگ کی طرف تھا۔

منشی جی کو قدرتاً بچوں سے بہت اُنس تھا۔ سارے محلے کے بچے اُنکی شفقت اور پیار
سے فیضیاب ہوتے رہتے تھے۔ جب وہ گھر سے نکلتے تو بچوں کا ایک لشکر ساتھ ہوتا۔ ایکبار
کوئی سنگدل ماں اپنے بچے کو مار رہی تھی۔ لڑکا بلک بلک کر روتا تھا۔ منشی جی سے ضبط نہ ہو سکا
دوڑے۔ بچے کو گود میں اُٹھالیا اور عورت کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔ اُس دن سے اُس نے
اپنے لڑکے کو مارنے کی قسم کھالی۔ جو شخص غیروں کے لڑکوں کا ایسا دلدادہ ہو وہ اپنے بچے کو
کتنا پیار کریگا اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ جب سے بیٹا پیدا ہوا منشی جی دُنیا کے
کل کاموں سے کنارہ کش ہو گئے۔ کہیں لڑکے کو ہنڈولے میں جھلا رہے ہیں۔ اور
خوش ہو رہے ہیں کہیں اسے خوشنما سیر گاڑی میں بٹھا کر خود کھینچ رہے ہیں۔

ایک لمحہ کے لئے اُسے اپنے پاس سے جُدا نہ کرتے۔ لڑکے کی محبت میں اپنے تئیں بھول گئے۔

سُبالا نے لڑکے کا نام پرتاپ چندر رکھا تھا اور جیسا اُس کا نام تھا ویسے ہی اُس کے اوصاف تھے۔ بلا کا ذہین۔ نہایت خوشرو۔ باتیں کرتا تو سُننے والے محو ہو جاتے۔ ستارۂ بلندی پیشانی پر چمکتا تھا۔ اعضا ایسے قوی کہ دو گنے قد و قامت کے لڑکوں کی کچھ حقیقت نہ سمجھتا۔ اس کمسنی ہی میں اُس کا چہرہ ایسا روشن اور متین تھا کہ یکایک کسی غیر شخص کے سامنے آ کر کھڑا ہو جاتا تو وہ حیرت سے تکنے لگتا تھا۔

اس طرح ہنستے کھیلتے چھ برس گذر گئے۔ عیش کے دن ہوا کی طرح سن سے گذر جاتے ہیں اور خبر نہیں ہوتی۔ یہ سیہ بختی کے دن اور مصیبت کی راتیں ہیں جو کاٹے نہیں کٹتیں۔ پرتاپ کو پیدا ہوئے ابھی کتنے دن گذرے۔ مُبارکباد کی دلآویز صدائیں کانوں میں گونج ہی رہی تھیں کہ چھٹی سالگرہ آ پہنچی اور چھٹے سال کا خاتمہ بڑے دنوں کا آغاز تھا۔ منشی سالگرام کا دُنیاوی تعلق محض نمائشی تھا۔ وہ بے لوث اور بے لاگ زندگی بسر کرتے تھے۔ اگرچہ ظاہر میں نگاہوں میں وہ معمولی دُنیاداروں کی طرح دُنیا کی کلفتوں سے رنجیدہ اور خوشیوں سے خوش نظر آتے مگر اُن کا دل ہمیشہ اُس اعلیٰ اور پُر سرور سکون کے مزے لیا کرتا تھا جس پر رنج کے جھونکوں اور خوشی کی تھپکیوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

ماگھ کا مہینہ تھا۔ الہ آباد میں کنبھ کا میلہ تھا۔ ریل گاڑیوں میں جاتری روئی کی طرح بھر بھر کر الہ آباد پہنچائے جا رہے تھے۔ اسی اسی برس کے بڈھے جنہیں برسوں سے اُٹھنا دوبھر تھا۔ لنگڑاتے۔ لاٹھیاں ٹیکتے۔ منزلیں طے کر کر کے پریاگ راج کو جا رہے تھے۔ بڑے بڑے سادھو مہاتما جن کے درشنوں کا اشتیاق لوگوں کو ہمالیہ کی تاریک گپھا

میں کھینچ لیجاتا تھا۔ اُس وقت گنگاجی کی پاک لہروں سے گلے ملنے کیلئے آئے ہُوئے تھے۔
منشی سالگ رام کا بھی جی للچایا۔ سُباما سے بولے۔ "کل اشنان ہے"۔
سُباما۔ "سارا محلہ سُونا ہوگیا۔ کوئی آدمی نہیں نظر آتا"
منشی۔ تم چلنے پر راضی نہیں ہوتیں ورنہ بڑا لُطف رہتا! ایسا میلہ تم نے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔
سُباما۔ ایسے میلوں سے میرا جی گھبراتا ہے۔
منشی۔ میرا تو جی نہیں مانتا۔ جب سے سُنا ہے کہ سوامی پرمانند جی آئے ہُوئے ہیں۔
تب سے ان کے درشن کے لئے طبیعت بیقرار ہو رہی ہے۔
سُباما پہلے تو اُن کے جانے پر راضی نہ ہوئی مگر جب دیکھا کہ یہ نہ مانیں گے
تب مجبوراً مان گئی۔ اُسی دن گیارہ بجے رات کو منشی جی پریاگ راج چلے۔ چلتے وقت پرتاپ
کا بوسہ لیا اور بیوی کو پیار سے گلے لگالیا۔ سُباما نے اُسوقت دیکھا کہ اُن کی آنکھوں میں
آنسو بھرے ہُوئے ہیں۔ اُسکا کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ جیسے چیت کے مہینے میں کالی کالی
گھٹائیں کو دیکھکر کسان کا کلیجہ کانپنے لگتا ہے اُسی طرح منشی جی کی آنکھوں میں آنسو دیکھکر
سُباما لرز گئی۔ آنسوؤں کی وہ بوندیں ویراگ اور تیاگ کا اتھاہ سمندر تھیں۔ دیکھنے میں وہ
کیسے ننھے ننھے پانی کے قطرے تھے مگر کیسے گہرے! اور کیسے وسیع!
اُدھر منشی جی مکان سے باہر نکلے اور سُباما نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔
کسی نے اُس کے دل میں کہا کہ اب تجھے اپنے پتی کے درشن نہ ہونگے۔ دو دن گزرے۔
تین دن گزرے۔ چوتھا دن آیا اور چلا گیا۔ یہاں تک کہ پورا ہفتہ گزر گیا اور منشی جی نہ
لوٹے۔ تب تو سُباما کو بیکلی ہونے لگی۔ تار دئے۔ آدمی دوڑائے۔ مگر کچھ پتہ نہ چلا۔
دوسرا ہفتہ بھی نہ اداسی میں ختم ہوگیا۔ اور منشی جی کی واپسی کی جو کچھ رہی سہی اُمیدیں

تھیں وہ بھی خاک میں مل گئیں۔

منشی جی کا مفقود الخبر ہونا نہ صرف اُن کے خاندان بلکہ سارے شہر کیلئے ایک افسوسناک واقعہ تھا۔ بازاروں میں۔ دُکانوں پر نشستگاہوں میں غرض ہر چہار طرف یہی مرکز گفتگو تھا۔ جو سنتا افسوس کرتا۔ کیا امیر کیا غریب یہ ماتم عام تھا اُن ہی کی ذات سے چاروں طرف زندہ دلی پھیلی رہتی تھی۔ اب یک ماتم چھایا ہوا تھا۔ جن گلیوں سے وہ بچوں کی فوج لیکر نکلتے تھے وہاں اب خاک اُڑ رہی تھی۔ بچے بار بار اُنکے پاس آنے کیلیے روتے اور ضد کرتے۔ اُن بیچاروں کو کیا خبر تھی کہ اب وہ محفل ویران ہو گئی۔ اُنکی مائیں آنچل سے مُنہ ڈھانپ ڈھانپ کر روتیں۔ جیسے اُن کا کوئی عزیز مر گیا ہو۔

یوں تو منشی جی کے غائب ہونے کا رونا سبھی رو رہے تھے۔ مگر سب سے گاڑھے آنسو اُن آڑھتیوں اور سوداگروں کی آنکھوں سے نکلتے تھے جنکا ابھی حساب کتاب نہیں ہوا تھا۔ دس بارہ دن تو انھوں نے جوں توں کر کے صبر کیا۔ مگر آخر کب تک ایک ایک کر کے حساب کی فردیں پیش ہونے لگیں۔ کسی برھم بھوج میں دو سو روپیہ کا گھی آیا ہے اور قیمت نہیں دیگئی۔ کہیں سے دو سو من میدہ آیا ہوا ہے۔ بزاز کا ہزاروں کا حساب ہے۔ مندر بنواتے وقت ایک مہاجن سے بیس ہزار قرض لیا گیا تھا۔ وہ ابھی جوں کا توں پڑا ہوا ہے۔ مطالبات کا تو یہ حال تھا اور اثاثہ کا یہ حال کہ بجز ایک عالیشان عمارت اور اُس کے لوازمات کے کوئی ایسی جائیداد نہ تھی جس سے کوئی رقم کثیر کھڑی ہو سکے اسکے سوا اب کوئی تدبیر نہ تھی کہ علاقہ نیلام پر چڑھا دیا جائے اور اُس کے محاصل سے مطالبات ادا کیئے جائیں۔

بیچاری سبا ماس رتھ کاٹنے بعد سیہ پر بیٹھی ہوئی تھی اور پرتاپ چند اپنے لکڑی

کے گھوڑے پر سوار آنگن میں نخ نخ کر رہا تھا کہ پنڈت مولٹے رام شاستری جو خاندان کے پروہت تھے مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ انہیں خوش دیکھ کر مایا ءس سُبالا چونک کر اٹھ بیٹھی کہ شاید یہ کوئی خوشخبری لائے ہیں۔ اُن کے لئے آسن بچھا دیا۔ اور اُمید وار نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ پنڈت جی آسن پر بیٹھے اور سونگھنی سونگھتے ہوئے بولے۔ "تم نے مہاجنوں کا حساب دیکھا؟"

سُبالا۔ (مایوسانہ لہجہ میں) "ہاں دیکھا تو"۔

مولٹے رام۔ رقم بڑی گہری ہے۔ منشی جی نے آگا پیچھا کچھ نہ سوچا۔ اپنے یہاں کوئی حساب کتاب نہ رکھا۔

سُبالا۔ ہاں اب مجھے یہ رقم گہری ہے۔ نہیں تو اتنا اتنا روپیہ ایک ایک بوجھ میں اُٹھ گیا ہے کیا؟

مولٹے رام۔ سب دن برابر نہیں جاتے۔

سُبالا۔ اب تو جو ایشور کریگا وہ ہوگا۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔

مولٹے رام۔ ہاں ایشور کی اچھا تو مول ہی ہے۔ مگر تم نے بھی کچھ سوچا ہے۔

سُبالا۔ ہاں علاقہ نیلام کر دونگی۔

مولٹے رام۔ رام رام یہ کیا کہتی ہو۔ علاقہ بک گیا تو پھر بات کیا رہ جائیگی۔

سُبالا۔ اس کے سوا اب کوئی تدبیر نہیں ہے۔

مولٹے رام۔ بھلا علاقہ ہاتھ سے نکل گیا تو تم لوگوں کا گزر بسر کیسے ہوگا۔

سُبالا۔ ہمارا ایشور مالک ہے۔ وہی بیڑہ پار لگا دیگا۔

مولٹے رام۔ یہ تو بڑے افسوس کی بات ہوگی کہ ایسے اپکاری آدمی کے لڑکے بالے دکھ اٹھائیں۔

سُبالا۔ ایشور کو یہی منظور ہے تو کسی کا کیا بس؟

موٹے رام۔ بھلا میں ایک جگت بتاؤں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

سُبھاما۔ ہاں بتلائیے آپ کا بڑا اُپکار ہوگا۔

موٹے رام۔ پہلے تو ایک درکھاس لکھوا کر کلکٹر صاحب کو دیدو کہ مالگذاری ماپھ کی جائے باقی روپیہ کا بندوبست ہمارے اوپر چھوڑ دو۔ ہم جو چاہیں گے کریں گے مگر اِلاکے پر آنچ نہ آنے پائیگی۔

سُبھاما۔ کچھ معلوم تو ہو آپ اتنا روپیہ کہاں سے لائیں گے؟

موٹے رام۔ تمہارے لئے روپے کا کلیان پنسی جی کے نام پر بلا لکھا پڑھی کے پچاس ہزار روپیہ کا بندوبست ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ روپیہ رکھا ہوا ہے تمہارے منہ سے ہاں نکلنے کی دیر ہے۔

سُبھاما۔ شہر کے رئیسوں نے جمع کیا ہوگا۔

موٹے رام۔ ہاں بات کی بات میں روپیہ جمع ہو گیا۔ صاحب کا اشارہ بہت تھا۔

سُبھاما۔ (کچھ سوچکر) معافی کی درخواست مجھ سے نہ لکھوائی جائیگی اور نہ اپنے پتی کے نام پر قرض لینا چاہتی ہوں میں سب کا ایک ایک پیسہ علاقہ سے ادا کر دونگی۔

یہ کہہ کر سُبھاما نے رکھائی کے ساتھ منہ پھیر لیا اور اُس کے زرد اور افسوسناک چہرہ پر ہلکا سا غصہ دکھائی دیا۔ موٹے رام نے دیکھا بات بگڑا چاہتی ہے تو سنبھلکر بولے:-

«اچھا جیسی تمہاری مرضی۔ اس میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ مدعا ہم نے تم کو کسی طرح کا دُکھ اُٹھاتے دیکھا تو اُس دن پرلے ہو جائیگا بس اتنا سمجھ لو»۔

سُبھاما۔ تو آپ کیا چاہتے ہیں کہ میں اپنے پتی کے نام پر دوسروں کے احسان کا بوجھ

رکھوں ہیں اسی گھر میں جل مرونگی۔ فاقے کرتے کرتے مرجاؤنگی۔ مگر کسی کا احسان نہ اُٹھاؤں گی۔

موٹے رام۔ چھی چھی! تمہارے اوپر اوسان کون کرسکتا ہے۔ کیسی بات مُنہ سے نکالتی ہو۔ کرج لینے میں کوئی سرم نہیں ہے۔ کون رئیس ہے جس پر لاکھ دو لاکھ کا کرج نہ ہو۔

شُیاما۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ اس قرض میں احسان شامل نہیں ہے۔

موٹے رام۔ شیاما! تمہاری بُدھ کہاں گئی ہے۔ بھلا تم سب طرح کے دُکھ اُٹھا لوگی۔ مگر کیا تمہیں اس بالک پر ترس نہیں آتا۔

موٹے رام کی یہ چوٹ کاری پڑی۔ شیاما آبدیدہ ہوگئی اور بیٹے کی طرف پُرحسرت نگاہوں سے دیکھا۔ اس بچے کے لئے کون کون سی تپسیا نہیں کی۔ کیا اب اسکی تقدیر میں دُکھ اُٹھانا لکھا ہے۔ جو پودہ کل ہوا کے تیز جھونکوں سے بچایا جاتا تھا جس پر آفتاب کی تیز کرنیں نہ پڑنے پاتی تھیں۔ جو تروتازگی کے ہنڈولے میں جھول رہا تھا۔ کیا وہ آج اس جلتی ہوئی دُھوپ اور اس آگ کی لپیٹ میں مرجھائیگا۔ شُیاما کئی منٹ تک اسی فکر میں بیٹھی رہی۔ موٹے رام دل میں خوش ہو رہے تھے کہ اب بازی مارلی۔ اتنے میں شُیاما نے سر اُٹھایا اور بولی جس کے باپ نے لاکھوں کو جلایا کھلایا وہ دوسروں کا آسریت نہیں بن سکتا۔ اگر آپ کا دھرم اس کی مدد کرے گا تو وہ خود دس کو کھلا کر کھائیگا (لڑکے کو بُلاتے ہوئے) "بیٹا! ذرا یہاں آؤ۔ کل سے تمہاری مٹھائی بند۔ دُودھ گھی سب بند ہوجائیگا روؤ گے تو نہیں"۔ یہ کہہ کر اس نے بیٹے کو پیار سے گود میں بٹھایا اور اُس کے

گلابی رخساروں سے پسینہ پونچھ کر ایک بوسہ لے لیا۔

پرتاپ۔ کیا کہا کل سے مٹھائی بند ہوگی۔ کیوں؟ کیا حلوائی کی دوکان میں مٹھائی نہیں ہے؟

سُباما۔ مٹھائی تو ہے مگر اس کا روپیہ کون دیگا؟

پرتاپ۔ "جب ہم بڑے ہونگے تو اسکو بہت سا روپیہ دینگے۔ چل ٹخ ٹخ دیکھو اماں کیسا تیز گھوڑا ہے۔" سُباما کی آنکھوں میں پھر آنسو اُمڈ آئے۔ افسوس! کیا اس حسن و نزاکت کے پتلے پر ابھی سے افلاس کی مصیبتیں آجائینگی۔ نہیں نہیں۔ میں خود سب بھگت لونگی مگر اپنے پیارے بچے پر مصیبت کی پرچھائیں نہ آنے دونگی۔ ماں تو یہ خیال کر رہی تھی۔ اور بیٹا اپنے منہ زور بد لگام اسپ چوبیں کو زیر کرنے میں ہمہ تن مصروف تھا۔ بچے ہوتے ہیں دل کے بادشاہ!

الغرض مولے رام نے بہت کچھ جال پھیلایا۔ بہت فصاحت و بلاغت صرف کی مگر سُباما نے ایک قدم نہیں کمر کے ہاں نہ کی۔ اُس کی اس وضعداری کا تذکرہ جس نے سنا واہ واہ کی۔ لوگوں کے دل میں اُس کی عزت دوچند ہوگئی۔ اُس نے وہی کیا جو ایسے سیر چشم اور دریا دل آدمی کی بیوی کے شایان شان تھا

اس کے پندرھویں دن علاقہ نیلام پر چڑھا۔ پچاس ہزار کی رقم وصول ہوئی کل مطالبے چکا دیے گئے۔ گھر کے بے ضرورت سامان فروخت کر دیے گئے۔ مکان میں بھی سُباما نے اندر سے اونچی اونچی دیواریں کھنچوا کے دو علیحدہ علیحدہ درجے کیے۔ ایک میں خود رہنے لگی اور دوسرا کرایہ پر اُٹھا دیا۔

نئے پڑوسیوں سے میل جول

منشی سنجیون لال جنہوں نے سُبھاما کا مکان کرایہ پر لیا تھا۔ اعلیٰ درجہ کے روشن خیال آدمی تھے۔ پہلے ایک سرکاری عہدہ پہ ممتاز تھے مگر اپنی آزاد طبیعت کے باعث افسروں کو خوش نہ رکھ سکے۔ یہاں تک کہ اُن کی ناراضی سے تنگ آ کر استعفا دیدیا دوران ملازمت میں تھوڑا سا سرمایہ فراہم کر لیا تھا۔ نوکری چھوڑتے ہی ٹھیکیداری کی طرف رجوع ہو گئے اور اپنی محنت اور جانفشانی سے تھوڑے ہی عرصہ میں اچھی خاصی حیثیت بنا لی۔ اُس وقت اُن کی آمدنی چار پانچ سو کی اوسط سے کم نہ تھی کچھ ایسی معاملہ فہم طبیعت پائی تھی کہ جس تعمیر میں ہاتھ لگاتے نفع کے سوا نقصان نہ ہوتا۔

منشی سنجیون لال کا کنبہ بہت بڑا نہ تھا۔ اولادیں تو ایشور نے کئی دیں مگر وہ سب بچپنے ہی میں داغ مفارقت دے گئی تھیں۔ اب اس وقت ماں باپ کی آنکھوں کی پتلی صرف ایک لڑکی تھی۔ اسکا نام برج رانی تھا۔ وہی والدین کی زندگی کا سہارا تھی۔

پرتاپ چندر اور برج رانی میں پہلے ہی دن سے دوستی شروع ہو گئی۔ آدھ گھنٹہ میں دونوں چڑیوں کی طرح چہکنے لگے۔ برجن نے اپنی گڑیاں کھلونے۔ باجے دکھلائے پرتاپ نے اپنی کتابیں قلم اور تصویریں پیش کیں۔ برجن کی ماں (سوشیلا) نے پرتاپ

کو گود میں لے لیا اور خوب پیار کیا۔ اُس دن سے وہ روز شام کو آتا۔ دونوں بھولی ساتھ ساتھ کھیلتے ایسا معلوم ہوتا کہ دونوں بھائی بہن ہیں۔ سوشیلا دونوں بچوں کو گود میں بٹھاتی اور پیار کرتی۔ گھنٹوں ٹکٹکی لگائے دونوں بچوں کو دیکھا کرتی۔ برجن بھی کبھی کبھی پرتاپ کے گھر جاتی۔ مصیبت کی ماری سُبلا اُسے دیکھ کر اپنی مصیبت بھول جاتی۔ چھاتی سے لگا لیتی اور اُس کی بھولی بھالی باتیں سُن کر اپنا غم غلط کرتی۔

ایک روز منشی سنجیون لال باہر سے آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پرتاپ اور برجن دونوں دفتر میں کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ پرتاپ کوئی کتاب پڑھ رہا ہے اور برجن دھیان لگائے سُن رہی ہے۔ دونوں نے جوں ہی منشی جی کو دیکھا اُٹھ کھڑے ہوئے۔ برجن تو دوڑ کر باپ کی گود میں جا بیٹھی اور پرتاپ سر نیچا کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ کیسا ذی شعور لڑکا تھا۔ سن ابھی آٹھ سال سے زیادہ نہ تھا۔ مگر بشرے سے آنیوالی عظمت جھلک رہی تھی۔ روشن اور مردانہ چہرہ۔ پاک صاف ہاتھ پاؤں۔ پتلے پتلے سرخ ہونٹھ۔ تیز چلتی ہوئی نگاہیں۔ کالے کالے بھونرے کی طرح بال اُس پر کپڑے صاف ستھرے منشی جی نے کہا۔ "یہاں آؤ پرتاپ"۔ پرتاپ آہستہ آہستہ کچھ ہچکچاتا۔ کچھ لجاتا قریب آیا۔ منشی جی نے پدرانہ محبت سے گود میں بٹھا لیا اور پوچھا۔ "تم ابھی کون سی کتاب پڑھ رہے تھے؟"

پرتاپ بولنے ہی کو تھا۔ کہ برجن بول اُٹھی "بابا بڑی اچھی اچھی کہانیاں تھیں۔ کیوں بابا کیا پہلے چڑیاں بھی ہماری طرح باتیں کرتی تھیں؟"

منشی جی مسکرا کر بولے:۔ "ہاں وہ خوب بولتی تھیں"

ابھی اُن کے منہ سے پوری بات بھی نہ نکلنے پائی تھی کہ پرتاپ جس کا شرمیلا پن اب دُور ہو چلا تھا۔ بول اُٹھا۔ "نہیں برجن۔ تمہیں بہلاتے ہیں

یہ کہانیاں بنائی ہوئی ہیں"۔

منشی جی اس بیباکانہ تردید پر خوب ہنسے۔

اب تو پرتاپ بلبل کی طرح چہکنے لگا۔ اسکول اتنا بڑا ہے کہ شہر بھر کے لوگ اُسمیں بیٹھ جائیں۔ دیواریں اتنی اونچی ہیں جیسے تاڑ۔ بلدیو پرشاد نے جو گیند میں ہٹ لگائی تو وہ آسمان میں چلا گیا۔ بڑے ماسٹر صاحب کی میز پر ہری ہری بانات بچھی ہوئی ہے۔ اُس پر پھولوں سے بھرے گلاس رکھے رہتے ہیں۔ گنگا جی کا پانی سفید ہے۔ ایسی زور سے بہتا ہے کہ پہاڑ بھی ہو تو بہہ جائے۔ وہاں ایک سادھو بابا ہیں۔ ریل دوڑتی ہے سَن سَن۔ اُس کا انجن بولتا ہے بھک بھک۔ انجن میں بھاپ ہوتی ہے۔ اُسی کے زور سے گاڑی چلتی ہے۔ گاڑی کے ساتھ درخت بھی دوڑتے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح کی کتنی باتیں پرتاپ نے اپنی بھولی زبان میں بیان کیں۔ برجن تصویر کی طرح خاموش بیٹھی ہوئی سُن رہی تھی۔ ریل پر وہ بھی دو تین بار سوار ہوئی تھی۔ مگر اُسے آجتک یہ نہ معلوم ہوا کہ اُسے کس نے بنایا۔ اور وہ کیونکر چلتی ہے۔ دو تین بار اُس نے اپنے گورو جی سے یہ سوال کیا تھا۔ مگر اُنھوں نے یہی کہکر ٹالدیا کہ بچہ ایشور کی مہما اپرم پار ہے۔ برجن نے بھی سمجھ رکھا تھا کہ ایشور کی مہما کوئی بڑا بھاری اور طاقتور گھوڑا ہوگا۔ جو اتنی گاڑیوں کو سَن سَن کھینچے لئے جاتا ہوگا۔ جب پرتاپ خاموش ہوا تو برجن نے باپ کے گلے میں ہاتھ ڈالکر کہا:۔

"بابا ہم بھی پرتاپ کی کتاب پڑھیں گے"۔

منشی۔ بیٹی تم تو سنسکرت پڑھتی ہو۔ یہ تو بھاشا ہے۔

برجن۔ تو میں بھی بھاشا ہی پڑھونگی۔ اس میں کیسی اچھی اچھی کہانیاں ہیں۔

میری کتاب میں تو ایک کہانی بھی نہیں۔ کیوں بابا پڑھنا کسے کہتے ہیں؟"

منشی جی بغلیں جھانکنے لگے۔ اُنہوں نے آج تک خود کبھی غور نہیں کیا تھا کہ پڑھنا کیا چیز ہے۔ ابھی وہ سر ہی کھجلا رہے تھے کہ پرتاپ بول اُٹھا۔ "مجھے تم نے پڑھتے دیکھا۔ اسی کو پڑھنا کہتے ہیں"

برجن۔ کیا میں نہیں پڑھتی۔ میرے پڑھنے کو پڑھنا نہیں کہتے؟

برجن سِدّھانت کومدی پڑھ رہی تھی۔ پرتاپ نے کہا۔ "تم طوطے کی طرح رٹتی ہو"۔

رشتۂ اتحاد مضبوط ہوتا ہے

کچھ عرصہ سے سُبامالے گنجائش نہ دیکھ کر مہرجن۔ کہار اور دو مہریوں کو جواب دیدیا تھا۔ کیونکہ اب نہ تو اُن کی کوئی ضرورت تھی اور نہ اُن کا خرچ سنبھالے سنبھلتا تھا۔ صرف ایک بُڑھیا مہری باقی رہگئی تھی۔ اوپر کا کام کاج وہ کرتی اور کھانا سُبامااپنے ہاتھ سے پکا لیتی۔ مگر بیچاری ایسی سخت محنت کی عادی تو تھی نہیں۔ چند ہی دنوں میں اسے تھکن کے سبب سے رات کو حرارت رہنے لگی۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچی کہ جب دیکھئے حرارت موجود۔ جسم پُھنکا جاتا ہے۔ نہ کھانے کی طرف رغبت ہے نہ پینے کی طرف۔ کسی کام میں جی نہیں لگتا۔ مگر وہ ہے کہ روز معمول کے موافق کام کئے جاتی ہے۔ دوا دارو کی بھی کوئی فکر نہیں اور نہ کسی سے اُس کا ذکر کرتی ہے۔ جبتک پرتاپ گھر پر رہتا ہے۔ تب تک وہ چہرے کو ذرا بھی مدّھم نہیں ہونے دیتی۔ مگر جوں ہی وہ مدرسہ چلا جاتا ہے۔ لحاف اوڑھ کر پڑرہتی ہے اور دن بھر پڑے پڑے کراہا کرتی ہے۔

پرتاپ سمجھدار لڑکا تھا۔ ماں کی حالت روز بروز خراب ہوتے دیکھ کر تاڑ گیا کہ یہ بیمار ہے۔ ایک دن اسکول سے لوٹا تو سیدھا اپنے گھر گیا۔ بیٹے کو دیکھتے ہی سُبامانے اُٹھ بیٹھنے کی کوشش کی۔ مگر مارے ضعف کے چکر آگیا۔ اور ہاتھ پاؤں اکڑ گئے۔ پرتاپ نے اُسے سنبھالا اور اُسکی طرف ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر بولا:۔ "اماں تم آج

کل بیمار ہو گیا۔ اتنی دُبلی کیوں ہو گئی ہو۔ دیکھو تمہارا جسم کتنا گرم ہے۔ ہاتھ نہیں رکھا جاتا۔"

سُباما نے ہنسنے کی کوشش کی۔ اپنی بیماری کا اظہار کر کے بیٹے کو کیسے تکلیف دے۔ ماں کا پاک اور بے غرض محبّت کا انتہائی درجہ ہے۔ آواز کو ہلکا بنا کر بولی :- "نہیں بیٹا بیمار تو نہیں ہوں۔ آج ذرا حرارت ہو آئی تھی۔ شام تک بالکل اچھی ہو جاؤنگی۔ الماری میں حلوا رکھا ہوا ہے نکال لو۔ نہیں تم آؤ بیٹھو۔ میں ہی نکالے دیتی ہوں"

پرتاپ۔ امّاں تم مجھ سے بہانہ کرتی ہو۔ تم ضرور بیمار ہو۔ ایکدن میں کوئی اتنا دبلا نہیں ہو جاتا۔

سُباما۔ (ہنسکر) کیا تمہارے دیکھنے میں مَیں دُبلی ہو گئی ہوں۔ مجھے تو نہیں معلوم ہوتا۔

پرتاپ۔ میں ڈاکٹر صاحب کے یہاں جاتا ہوں۔

سُباما۔ (پرتاپ کا ہاتھ پکڑ کر) تم کیا جانو وہ کہاں رہتے ہیں؟

پرتاپ۔ پُوچھتے پُوچھتے چلا جاؤنگا۔

سُباما کچھ اور کہا چاہتی تھی۔ کہ اُسے پھر چکر آیا۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ پرتاپ اُس کی یہ حالت دیکھتے ہی سہم گیا۔ اور کچھ تو نہ ہو سکا۔ دوڑا ہوا برجن کے دروازہ پر آیا اور کھڑا ہو کر رونے لگا۔

ہر روز وہ اس وقت تک برجن کے گھر پہنچ جاتا تھا۔ آج جو دیر ہوئی تو وہ گھبرائی ہوئی اِدھر اُدھر پھر رہی تھی۔ یکایک جو دروازہ پر جھانکنے آئی تو پرتاپ کو دونوں ہاتھوں سے مُنہ چھپائے دیکھا۔ پہلے تو سمجھی کہ اُسنے دل لگی سے مُنہ چھپالیا ہے۔ مگر جب اُس کے

ہاتھ ہٹائے تو آنسو نظر آئے۔ چونک کر بولی "للّو کیوں روتے ہو؟ بتا دو"۔

پرتاپ نے کچھ جواب نہ دیا۔ بلکہ اور سسکنے لگا۔

برجن۔ نہ بتاؤ گے۔ کیا چچی نے کچھ کہا ہے۔ جاؤ تم چپ نہیں ہوتے۔

پرتاپ نے کہا۔ "نہیں برجن۔ اماں بہت بیمار ہیں"۔

یہ سنتے ہی برج رانی دوڑی اور دم زدن میں سُباما کے سرہانے آ کھڑی ہوئی دیکھا تو وہ بے حس و حرکت پڑی ہے۔ آنکھیں بند ہیں اور سانس زور زور سے چل رہی ہے ہاتھ پکڑ کر جھنجوڑنے لگی "چچی کیسا جی ہے۔ آنکھیں کھولو۔ کیسا جی ہے"؟

مگر چچی نے آنکھیں نہ کھولیں۔ تب اُس نے طاق پر سے تیل اُتار لیا اور سُباما کے سر میں ڈال کر آہستہ آہستہ ملنے لگی۔ اُس غریب کے سر میں مہینوں سے تیل پڑنے کی نوبت نہ آئی تھی۔ ٹھنڈک پہنچی تو آنکھیں کھل گئیں۔

برجن۔ چچی۔ کیسا جی ہے؟ کہیں درد تو نہیں؟

سُباما۔ نہیں بیٹی درد کہیں نہیں ہے! اب میں بالکل اچھی ہوں۔ بھیّا کہاں ہے؟

برجن۔ وہ تو میرے گھر ہیں۔ بہت رو رہے تھے۔

سُباما۔ تم جاؤ اُس کے ساتھ کھیلو۔ اب میں بالکل اچھی ہوں۔

برجن۔ میں ابھی نہ جاؤں گی جب تم اچھی ہو جاؤ گی۔ تب جاؤں گی۔

ابھی یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ سوشیلا بھی داخل ہوئی۔ اُسے سُباما سے ملنے کا تو بہت دنوں سے اشتیاق تھا۔ مگر کوئی موقع نہ ملتا تھا۔ اس وقت عیادت کے بہانے سے آ پہنچی۔ برجن نے اپنی ماں کو دیکھا تو اُچھل پڑی اور تالی بجا بجا کر کہنے لگی۔ اماں آئیں۔ اماں آئیں۔

دونوں عورتوں میں شکوہ شکایت ہونے لگی۔ باتوں باتوں میں چراغ جل گیا۔ کسی کو خیال بھی گزرا کہ پرتاپ کہاں ہے۔ ذرا دیر تک تو وہ دروازے پر کھڑا روتا رہا پھر یکایک آنکھیں پونچھکر ڈاکٹر کے مکان کی طرف لپکتا ہوا چلا۔ ڈاکٹر صاحب منشی سالگرام کے دوستوں میں تھے اور جب کبھی ضرورت ہوتی وہی بلائے جاتے۔ پرتاپ کو صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ برنا ندی کے کنارے لال بنگلے میں رہتے ہیں۔ اُسے ابتک اپنے محلے سے باہر نکلنے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ مگر اسوقت فرزندانہ جوش کی بیقراری میں اُسے ان رکاوٹوں کا مطلق دھیان نہ آیا گھر سے نکل کر بازار میں آیا اور ایک یکے والے سے بولا لال بنگلے چلوگے؟ لال بنگلہ مشہور جگہ تھی۔ یکہ والا تیار ہوگیا۔ اور آٹھ بجتے بجتے ڈاکٹر صاحب کی فٹن سُبیاما کے دروازے پر آپہنچی۔ یہاں اسوقت چاروں طرف اُسکی تلاش ہو رہی تھی کہ دفعتاً وہ متانت کے ساتھ قدم بڑھاتا اندر آگیا۔ اور بولا "پردہ کرو ڈاکٹر صاحب آتے ہیں"

سُبیاما اور سُشیلا دونوں چونک پڑیں۔ سمجھ گئیں کہ یہ ڈاکٹر صاحب کو بلانے چلا گیا تھا۔ سُبیاما نے فرطِ محبت سے اُسے گود میں بٹھالیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر پوچھنے لگی۔ کیا اکیلے چلے گئے تھے۔ تمہیں راستہ کیسے معلوم ہوا۔ ڈر نہیں لگا؟ ہم سے بتلایا بھی نہیں۔ یونہی چلے۔ تم کھو جاتے تو میں کیا کرتی۔ ایسا لال کہاں پاتی۔ یہ کہہ کہہ کر ماں نے بیٹے کو بار بار چوما۔ پرتاپ ایسا خوش تھا گویا امتحان میں پاس ہوگیا۔ ذرا دیر میں پردہ ہوا اور ڈاکٹر صاحب آئے۔ سُبیاما کی نبض دیکھی تشفی دی۔ پرتاپ کو گود میں بٹھا کر باتیں کرتے رہے۔ دوا ساتھ لیتے آئے تھے۔ اُسے پلانے کی تاکید کر کے نو بجے اپنے بنگلے کو واپس گئے۔ مگر چونکہ بخار پرانا تھا۔ پورے مہینہ بھر سُبیاما کو کڑوی کڑوی دوائیں پینی پڑیں۔ ڈاکٹر صاحب دونوں وقت آتے اور ایسی توجہ اور شفقت

سے پیش آتے۔ گویا شُباما اُنکی بہن ہے۔ ایک دفعہ شُباما نے ڈرتے ڈرتے فیس کے روپے ایک طشتری میں رکھکر پیش کئے تاکہ ڈاکٹر صاحب نے اُنہیں ہاتھ تک نہ لگایا۔ صرف اتنا کہا۔ "اسے میری طرف سے پرتاپ کو دیدیجئیگا۔ وہ پاؤں پاؤں مدرسے جاتا ہے۔ پیر گاڑی مول لے لیگا۔"

برجن اور اس کی ماں دونوں آٹھوں پہر اُس کی تیمارداری کے لئے حاضر رہتیں۔ ماں چاہے تساہلی بھی کرجائے مگر برجن وہاں سے ایک دم کو بھی نہ ہٹتی۔ دوا پلاتی۔ پانی دیتی۔ جب شُباما کی طبیعت ہلکی ہوتی تو اُس سے بھولی بھولی باتیں کرکے اُسکا دل بہلاتی۔ کھیلنا کودنا سب چھُوٹ گیا۔ جب شُباما بہت اصرار کرتی تو ذرا دیر کے لئے پرتاپ کے ساتھ باغیچہ میں کھیلنے چلی جاتی چراغ جلتے ہی پھر آبیٹھتی اور جب تک مارے نیند کے جھک جھک نہ پڑتی وہاں سے اُٹھنے کا نام نہ لیتی۔ بلکہ اکثر وہیں سوجاتی۔ رات کو آدمی گود میں اٹھاکر گھر لیجاتا۔ نہیں معلوم اُسے ایسی کیا دُھن سوار ہوگئی تھی۔

ایک دن برج رانی سباما کے سرہانے بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔ نہ جانے کس خیال میں غرق تھی۔ آنکھیں دیوار کی طرف لگی ہوئی تھیں اور جسطرح درختوں پر چاندنی لہراتی ہے اُسی طرح ہلکی ہلکی مُسکراہٹ اُسکے لبوں پر لہرا رہی تھی۔ اُسے مطلق خبر نہ تھی کہ چچی میری طرف تاک رہی ہیں۔ دفعتاً اُسکے ہاتھ سے پنکھیا چھوٹ پڑی جوں ہی وہ اسے اُٹھانے کے لئے جھکی کہ شُباما نے اُسے گلے سے لگا لیا۔ اور چمکار کر پوچھا:۔ "برجن سچ بتلادو۔ تم اب کیا سوچ رہی تھیں؟"

برجن نے سر جھکا لیا اور کچھ شرما کر بولی۔ "کچھ نہیں تم سے نہ بتلاؤنگی"

شیلا (چمکار کر) میری اچھی برجن۔ بتا دے کیا سوچتی تھی۔
برجن۔ (لجاتے ہوئے) سوچتی تھی کہ..... جاؤ ہنسو مت...... نہ بتلاؤنگی۔
شیلا۔ اچھا نہ ہنسونگی۔ بتاؤ۔ لے یہی تو اب اچھا نہیں لگتا۔ پھر میں آنکھ بند کر لونگی۔
برجن۔ کسی سے کہو گی تو نہیں؟
شیلا۔ نہیں کسی سے نہ کہونگی۔
برجن۔ سوچتی تھی کہ جب پرتاپ سے میرا بیاہ ہو جائیگا تو خوب مزے سے رہونگی۔
سُباما نے اسے سینے سے چمٹا لیا اور بولی "بیٹی وہ تو تیرا بھائی ہے"۔
برجن۔ ہاں بھائی ہے۔ میں جان گئی۔ تم مجھے بہو نہ بناؤ گی۔
سُباما۔ آج للو کو آنے دو۔ اس سے پوچھونگی دیکھوں کیا کہتا ہے
برجن۔ نہیں نہیں اُن سے نہ کہنا۔ میں تمہارے پیروں پڑوں۔
سُباما۔ میں تو کہہ دوں گی۔
برجن۔ تمہیں ہماری قسم ان سے نہ کہنا۔

شریفانہ زندگی کے نظارے

دن جاتے دیر نہیں لگتی۔ دو سال گزر گئے۔ پنڈت موٹے رام روز علی الصباح آتے اور سدھا نت کومدی پڑھاتے۔ حالانکہ اب اُن کا آنا محض رسمًا تھا۔ کیونکہ اس کتاب کے پڑھنے میں برجن کا دل مطلق نہ لگتا۔ ایک دن انجنیئر کے دفتر سے آئے۔ کمرہ میں بیٹھے ہوئے نوکر جوتے کا فیتہ کھول رہا تھا کہ بڑھیا مہری مسکراتی ہوئی گھر میں سے نکلی اور انکے ہاتھ میں ایک سربمہر لفافہ رکھدیا اور منہ پھیر کر ہنسنے لگی۔ سرنامہ پر لکھا ہوا تھا۔ "بخدمت جناب بابا صاحب برسد"

منشی۔ ارے تو کس کا لفافہ لے آئی۔ یہ میرا نہیں ہے۔

مہری۔ سرکار ہی کا تو ہے۔ کھولیں تو آپ۔

منشی۔ کس نے دیا کوئی آدمی باہر سے آیا تھا؟

مہری۔ (مسکراتی ہوئی) آپ کھولیں گے تو پتہ لگ جائیگا۔

منشی جی نے حیرت میں آ کر لفافہ کھولا تو یہ عبارت لکھی ہوئی تھی۔

بابا کو برجن کا پرنام اور پالاگن پہنچے۔ یہاں آپکی کرپا سے کشل منگل ہے۔ آپکا کشل منگل شری وشونا تھ جی سے سدا منایا کرتی ہوں۔ میں نے پرتابؔ سے بھاشا سیکھ لی وہ اسکول سے شام کو آ کر مجھے روز پڑھاتے ہیں اور آپ ہمارے لئے اچھی اچھی کتابیں لائیے۔ کیونکہ پڑھنا ہی زندگی کا سُکھ ہے اور ودیا انمول چیز ہے۔ وید پران میں اسکا

مہاتم لکھا ہوا ہے۔ آدمی کو چاہیئے کہ ودیا دھن دل و جان سے جمع کرے۔ ودیا سے
سب دکھ دور ہو جاتے ہیں میں نے کل شام کو بتیال پچیسی کی کہانی چچی کو سنائی تھی
اُنہوں نے مجھے ایک خوبصورت گڑیا انام دی ہے بہت اچھی ہے۔ میں اُس کا بیاہ
کرونگی۔ تب آپ سے روپیہ لونگی۔ میں اب پنڈت جی سے نہ پڑھونگی۔ اماں نہیں جانتیں
کہ میں بھائی سا پڑھتی ہوں۔ آپ کی پیاری "برجن"

القاب دیکھتے ہی منشی جی کے کلیجہ میں گدگدی محسوس ہونے لگی۔ پھر تو ایک ہی
نظر میں سارا خط پڑھ ڈالا۔ مارے خوشی کے ننگے پاؤں ہنستے ہوئے اندر دوڑے۔
برجن کو گود میں اُٹھالیا۔ اور دونوں بچوں کا ہاتھ پکڑے ہوئے سوشیلا کے پاس
گئے اور خط دکھا کر کہا۔ "بوجھو کس کا خط ہے؟"

سوسیلا۔ لاؤ ہاتھ میں دو۔ دیکھوں۔

منشی جی۔ نہیں وہیں سے بیٹھے بیٹھے بتاؤ۔ جلدی۔

سوسیلا۔ بوجھ جاؤں تو کیا دوگے۔

منشی جی۔ پچاس روپے دودھ کے دھوئے ہوئے۔

سوسیلا۔ پہلے روپیہ نکال کر رکھدو۔ نہیں تو مکر جاؤ گے۔

منشی جی۔ مکر نے والے کو کچھ کہتا ہوں۔ ابھی روپیہ لو۔ ایسا کوئی ٹٹ پونجیا
سمجھ لیا ہے؟

یہ کہہ کر دس روپیہ کا ایک نوٹ جیب سے نکال کر دکھایا۔

سوسیلا۔ کتنے کا نوٹ ہے؟

منشی جی۔ پچاس روپیہ کا۔ ہاتھ میں لیکر دیکھ لو۔

سوسیلا۔ لے لونگی۔ کہے دیتی ہوں۔
منشی جی۔ ہاں ہاں۔ لے لینا۔ پہلے بتاؤ تو سہی۔
سوسیلا۔ للو کا ہے۔ لائیے نوٹ۔ اب میں نہ مانونگی۔
یہ کہہ کر وہ اٹھی اور منشی جی کا ہاتھ پکڑ لیا۔
منشی جی۔ ایسی کیا زبردستی ہے۔ نوٹ چھینے لیتی ہو۔
سوسیلا۔ زبان نہیں دی تھی۔ ابھی سے مکرنے لگے۔
منشی جی۔ تم نے بوجھا بھی؟ صاف دھوکا کھا گئیں۔
سوسیلا۔ چلو چلو بہانہ کرتے ہو۔ نوٹ ہضم کرنے کی نیت ہے۔ کیوں للو یہ تمہارا ہی خط ہے نہ؟
پرتاپ نے نیچی نگاہوں سے منشی جی کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا "میں نے کہاں لکھا"؟
منشی جی۔ شرماؤ شرماؤ۔
سوسیلا۔ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ اسی کا خط ہے۔ تم لوگ آپس میں گٹھ کر آئے ہو۔
پرتاپ۔ میرا خط نہیں ہے۔ سچ۔ برجن نے لکھا ہے۔
سوسیلا کے منہ سے بے اختیار نکلا "برجن کا"! اور اس نے دوڑ کر شوہر کے ہاتھ سے خط چھین لیا اور بھوچک ہو کر اسے دیکھنے لگی مگر اب بھی یقین نہ آیا برجن سے پوچھا "کیوں بیٹی یہ تمہارا لکھا ہے۔ برجن نے سر جھکا کر کہا "ہاں"۔ یہ سنتے ہی ماں نے اسے گلے لگا لیا! اب آج سے برجن کا یہ حال ہو گیا کہ جب دیکھئے قلم دان لئے بیٹھی ہے اور کاغذ سیاہ کر رہی ہے۔ گھر کے کام دھندے سے تو اسے پہلے ہی سے

کچھ بس و کار نہ تھا۔ لکھنے کا آنا سونے پر سہاگہ ہو گیا۔ ماں اس کی مصروفیت دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی۔ باپ پھولا نہ سماتا۔ نت نئی کتابیں لاتا کہ برجن ہوشیار ہو جائیگی تو پڑھیگی۔ اگر وہ کبھی اپنا پیر آپ دھولیتی یا کھانا کھا کر آپ ہی ہاتھ دھونے لگتی تو ماں مہرولیں پر برس پڑتی ہیں "آنکھیں پھوٹ گئی ہیں۔ چربی چھا گئی ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے پانی انڈیل رہی ہے اور تم کھڑی منہ تاکتی ہو۔"

اسی طرح دن گزرتے چلے گئے۔ برجن کا بارھواں سال پورا ہوا مگر ابھی تک اُسے چاول اُبالنے کا شعور نہ تھا۔ چولھے کے سامنے بیٹھنے کا کبھی اتفاق ہی نہیں ہوا۔ سُباما نے ایک دن اُس کی ماں سے کہا "بہن برجن سیانی ہوئی۔ کیا کچھ گن ڈھنگ نہ سکھاؤگی؟"

سوسیلا۔ کیا کہوں۔ جی تو چاہتا ہے کہ لگا لگاؤں مگر کچھ سوچکر رہ جاتی ہوں۔

سُباما۔ کیا سوچکر رہ جاتی ہو؟

سوسیلا۔ کچھ نہیں۔ آلکس آجاتا ہے۔

سُباما۔ تو یہ کام میرے سپرد کردو۔ کھانا پکانا عورتوں کے لئے سب سے ضروری بات ہے۔

سوسیلا۔ ابھی چولھے کے سامنے اُس سے بیٹھا نہ جائیگا۔

سباما۔ کام کرنے ہی سے آتا ہے۔

سوسیلا۔ (جھینپتے ہوئے) پھول سے گال کمھلا جائیں گے۔

سُباما۔ (ہنسکر) بلا پھول کے مرجھائے کہیں پھل لگا ہے؟

دوسرے دن سے برجن کھانا پکانے لگی۔ پہلے دس پانچ دن اُسے چولھے

کے سامنے بیٹھنے میں سخت تکلیف ہوئی۔ آگ نہ جلتی۔ پھونکنے لگتی تو آنکھوں سے پانی بہتا۔ وہ بوٹی کی طرح لال ہو جاتیں۔ چنگاریوں سے کئی ریشمی ساڑیاں ستیاناس ہو گئیں۔ ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے مگر رفتہ رفتہ یہ سب مصیبتیں رفع ہو گئیں۔ سُبالا ایسی نیک مزاج عورت تھی کہ کبھی ناراض نہ ہوتی۔ ہمیشہ چمکار کر اُسے کام میں لگائے رہتی۔

ابھی برجن کو کھانا پکاتے دو ماہ سے زیادہ نہ گزرے ہونگے کہ ایک دن اُس نے پرتاپ سے کہا۔ "للّو مجھے کھانا پکانا آ گیا۔

پرتاپ۔ سچ!

برجن۔ کل چچی نے میرا پکایا کھانا کھایا تھا۔ بہت خوش ہوئیں۔

پرتاپ۔ تو بھئی ایک دن میری بھی دعوت کرو۔

برجن۔ (خوش ہو کر) اچھا کل۔

دوسرے دن نو بجے برجن نے پرتاپ کو کھانے کے لئے بُلایا۔ اُس نے جا کر دیکھا تو چوکا لگا ہوا ہے۔ تازی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو آ رہی ہے۔ آسن صفائی سے بچھا ہوا ہے۔ ایک تھالی میں چاول اور چپاتیاں ہیں۔ دال اور ترکاریاں الگ الگ کٹوروں میں رکھی ہوئی ہیں۔ لوٹا اور گلاس پانی سے بھرا ہوا موجود ہے۔ یہ صفائی اور سلیقہ دیکھ کر پرتاپ سیدھا دوڑا ہوا منشی سنجیون لال کے پاس گیا۔ اور انہیں لا کر چوکے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ منشی جی فرط مسرت سے اُچھل پڑے چٹ کپڑے اُتار ہاتھ پیر دھو پرتاپ کے ساتھ چوکے میں جا بیٹھے۔ بیچاری برجن کو کیا معلوم تھا کہ یہ حضرت بھی بن بلائے مہمان ہو جائیں گے۔ اُس نے صرف

پرتاپ کے لئے کھانا بنایا تھا - اسوقت بہت شرمائی اور نیچی نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھنے لگی - سوشیلا تاڑ گئی مسکرا کر منشی جی سے بولی "تمہارے لئے کھانا تیار ہے - لڑکوں کے بیچ میں کیا آ کے کود پڑے"

برج رانی نے شرماتے ہوئے دو تھالیوں میں تھوڑا تھوڑا کھانا پرسا -

منشی جی - برجن نے چپاتیاں خوب بنائی ہیں - نرم - سفید اور میٹھی -

پرتاپ - چاول دیکھئے بکھرا دو اور برجن لو -

منشی جی - میں نے ایسی چپاتیاں کبھی نہیں کھائیں - سالن بہت لذیذ ہے -

پرتاپ - برجن! چچا کو شوربے دار آلو دو -

یہ کہہ کر ہنسنے لگا - برجن نے لجا کر سر نیچا کر لیا - پتلی خشک ہو رہی تھی -

سوسیلا (شوہر سے) اب اٹھو گے بھی ؟ ساری رسوئیں چٹ کر گئے اور ابھی اڑے بیٹھے ہو -

منشی جی - کیا تمہاری رال ٹپک رہی ہے -

آخر دونوں آدمی رسوئیں کا صفایا کر کے اُٹھے - منشی جی نے اُسی وقت ایک اشرفی نکالکر برجن کو انعام دی ؛

ڈپٹی شیاما چرن

ڈپٹی شیاما چرن کا رعب سارے شہر پر طاری تھا۔ شہر میں کوئی ایسا
حاکم نہ تھا جسکی لوگ اتنی عزت کرتے ہوں۔ اس کا باعث کچھ تو یہ تھا۔ کہ وہ
مزاج کے بہت خلیق اور حلیم تھے اور کچھ یہ کہ رشوت سے انہیں قطعی احتراز تھا
منصفانہ نگاہ ایسی باریک تھی کہ دس بارہ برس کے عرصہ میں مشکل سے ان کے
دو چار فیصلوں کی اپیل ہوئی ہوگی۔ انگریزی کا ایک حرف نہ جانتے تھے مگر اچھے
اچھے بیرسٹروں اور وکیلوں کو بھی ان کی قانونی دستگاہ اور نکتہ رسی پر حیرت ہوتی
تھی مزاج میں آزاد پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مکان اور کچہری
کے سوا کسی نے انہیں اور کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا۔ منشی سالگ رام
جبتک زندہ یا یوں کہو کہ موجود تھے تو کبھی کبھی اُن کے یہاں تفریحاً چلے جاتے
تھے۔ جب سے وہ لاپتہ ہوئے ڈپٹی صاحب نے گھر چھوڑ کر ہلنے کی قسم کھالی۔ کئی
برس ہوئے ایکبار کلکٹر صاحب کے سلام کو حاضر ہوئے تھے۔ خانساماں نے
کہا صاحب غسل کر رہے ہیں دو گھنٹہ تک برآمدے میں ایک مونڈھے
پر بیٹھے انتظار کرتے رہے۔ اس کے بعد صاحب بہادر ہاتھ میں ایک ٹینس بیٹ
لئے ہوئے نکلے اور معذرت کے طور پر کہا۔ "بابو صاحب ہم کو بہت افسوس ہے
کہ آپکو ہمارا راہ دیکھنا پڑا۔ ہم کو آج فرصت نہیں ہے کلب کو جانا ہے۔

آپ پھر کبھی آویں‘‘۔ یہ سُنکر انہوں نے صاحب بہادر کو فرشی سلام کیا اور اتنی سی بات پر پھر کسی انگریزی کی ملاقات کو نہ گئے۔

بابو شیاما چرن اگرچہ کسی معنی میں حریص شہرت نہ تھے مگر اپنے نام نیک کو بدنامی کی ہوا سے بچاتے رہتے تھے خاندانی اعزاز اور وجاہت پر بھی اُنہیں کسی قدر فخر تھا۔ اپنی وضع کے وہ بڑے رنگین مزاج آدمی تھے اُن کی باتیں ظرافت سے بھری ہوتی تھیں۔ شام کے وقت جب وہ چند منتخب احباب کے ساتھ صحن میں بیٹھتے تو اُن کے قہقہوں کی گونجتی ہوئی آواز باغیچہ سے سنائی دیتی تھی۔ نوکروں چاکروں سے وہ بہت بے تکلفی کا برتاؤ رکھتے۔ یہاں تک کہ اُن کے ساتھ الاؤ کے گرد بیٹھنے سے بھی عار نہ تھا۔ مگر اُن کا رعب کچھ ایسا چھایا ہوا تھا کہ کسی کو اُن کی اِن کمزوریوں سے بیجا فائدہ اُٹھانے کی جرأت نہ ہو سکتی تھی۔ وضع قطع سادہ رکھتے کوٹ پتلون سے اُنہیں نفرت تھی۔ بٹن دار اُونچی اچکن۔ اس پر ایک ریشمی کامرکی عبا۔ سیاہ شملہ۔ ڈھیلا پاجامہ اور دلّی کی ساخت کا نوکدار جوتا۔ اُنکی خاص وضع تھی۔ اور اُن کے دوہرے بدن۔ سُرخ و سفید چہرہ اور درمیانہ قد پر جس قدر یہ لباس زیب دیتا تھا۔ اُتنا کوٹ پتلون سے ممکن نہ تھا۔

مگر ڈپٹی شیاما چرن کا رعب چاہے سارے شہر میں چھایا ہوا ہو۔ خود اپنے گھر کی چہار دیواری کے اندر اُنکی ایک نہ چلتی تھی۔ یہاں مسز شیاما چرن کی عملداری تھی اور وہ اپنے ممالک محروسہ میں مطلق العنانی کے ساتھ راج کرتی تھیں نوکروں کا تقرر۔ اُنکی برخاستگی۔ اُنکی سزا۔ خانگی ضروریات۔ لین دین۔ غرض اُن کل اُمور میں اُنہیں سیاہ و سفید کا اختیار تھا۔ کئی برس گزرے ڈپٹی صاحب نے

پریم وتی کی مرضی کے خلاف ایک مہراجن نوکر رکھ لی تھی۔ مہراجن ذرا رنگیلی تھی۔ پریم وتی
اپنے شوہر کی اس مداخلت بیجا پر ایسی برہم ہوئی کہ ہفتوں تک کوپ بھون میں
بیٹھی رہی۔ آخر نیچ ہو کر ڈپٹی صاحب نے مہراجن کو رخصت کر دیا۔ تب سے انہیں
پھر خانگی معاملات میں رخنہ ڈالنے کی کبھی ہمت نہ پڑی۔ حالانکہ بیچارے بہت
متقی اور پاک نفس آدمی تھے اور اب سن بھی چالیس سے متجاوز ہو گیا تھا۔ مگر پریم وتی کے
دل میں ابھی تک اُن کی جانب سے بدگمانی بنی ہوئی تھی۔ اُس کا مزاج "خلقتہً
تحکمانہ واقع ہوا تھا۔ اُس کے ساتھ ہی اُسے چھوٹی شیخی اور بڑے بول سے سخت
نفرت تھی۔ جب کبھی وہ شہر میں کسی کے یہاں تقریبوں میں شریک ہونے کیلئے
جاتی تو گویا یہ مسلّمہ بات تھی کہ وہاں بدمزگی ضرور پیدا ہوگی۔ عورتوں کو بڑھ بڑھ کے
باتیں بناتے دیکھ کر اُس سے ضبط نہ ہوتا۔ برس پڑتی اور حق کے اظہار سے وہ
کبھی نہ چوکتی۔ چاہے اس کی پاداش میں اُسے تو تو میں میں بھی کیوں نہ کرنا پڑے
اور طعنوں کے تیر چبھونے میں تو اُسے خاص ملکہ تھا۔

منشی جی کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ بڑا لڑکا رادھا چرن پچھلے سال ڈگری
حاصل کر کے اسوقت رُڑکی کالج میں پڑھتا تھا۔ اُس کی شادی فتحپور سیکری کے
ایک رئیس کے یہاں ہوئی تھی۔ منجھلی لڑکی کا نام سیوتی تھا۔ اس کی شادی بھی الٰہ آباد
کے ایک متمول گھرانے میں ہو گئی تھی۔ چھوٹا لڑکا کملا چرن ابھی تک بن بیاہا تھا۔
پریم وتی نے بچپنے ہی سے لاڈ پیار کر کے اُسے ایسا بیباک اور بدشوق بنا
دیا تھا۔ کہ اس کی طبیعت پڑھنے لکھنے کی طرف ذرا بھی نہ مائل ہوتی۔ پندرہ
برس کا ہو چکا تھا۔ مگر ابھی تک سیدھا سا خط لکھنے کی بھی تمیز نہ تھی۔ میاں

جی کے بیٹھے۔ اُنہیں اُس نے مہینہ بھر کے اندر نکال کر دم لیا۔ تب مدرسے میں نام لکھایا گیا۔ وہاں جاتے ہی اُسے بخار چڑھ آتا۔ درد سر شروع ہو جاتا۔ اس لئے وہاں سے بھی اُٹھا لیا۔ تب ایک ماسٹر صاحب اتالیقی پر مامور ہوئے۔ مگر اُن کے تین مہینے کی دوران ملازمت میں کملا چرن نے مشکل سے تین سبق پڑھے ہونگے۔ آخر ماسٹر صاحب بھی رخصت ہوئے۔ تب ڈپٹی صاحب نے خود پڑھانے کی ٹھانی۔ مگر ایک ہی ہفتہ میں اُنہیں کئی بار کملا کا سر ہلانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ گواہوں کے بیانات اور وکلاء کی جرحوں کی تہ تک پہنچنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا کسی بدشوق لڑکے کے دل میں تعلیم کی رغبت پیدا کرنا۔ پریم وتی نے اس مار دھاڑ پر ایسی داد فریاد مچائی۔ کہ آخر ڈپٹی صاحب نے بھی جھلا کر چھوڑ دیا۔ کملا کچھ ایسا قبول صورت۔ ایسا نازک بدن اور شیریں زبان تھا۔ کہ ماں اُسے سب لڑکوں سے زیادہ چاہتی۔ اس کی نازبرداریوں نے کملا کو کنکوے بازی۔ کبوتر بازی اور اسی قبیل کے دوسرے مشاغل کا دلدادہ بنا دیا تھا۔ صبح ہوئی۔ اور کبوتر اڑائے جانے لگے۔ بٹیروں کے جوڑ چھوٹنے لگے۔ شام ہوئی اور کنکوے کے لمبے لمبے پیچ ہونے لگے۔ کچھ دنوں سے جوئے کا چسکا بھی پڑ چلا تھا۔ آئینہ کنگھی اور عطر تیل میں تو گویا اُسکی جان بستی تھی۔ سن ابھی کچھ نہ تھا۔ مگر شہدوں کے فیض صحبت سے نظر بازی میں بھی شہرہ آفاق تھے۔

پریم وتی ایک دن سُشیلا سے ملنے گئی ہوئی تھی وہاں اُس نے برج رانی کو دیکھا اور اُسی دن سے اُسکا جی للچایا ہوا تھا کہ اگر یہ بہو بنکر میرے گھر میں آئے تو گھر کے بھاگ جاگ اُٹھیں۔ ایک رازداں عورت کے ذریعہ سے سر یلا

پر اپنا عندیہ ظاہر کیا۔ برجن کو تیرھواں سال شروع ہو چکا تھا۔ میاں بیوی میں شادی کے متعلق صلاح و مشورہ ہو رہا تھا۔ پریم وتی کا عندیہ پا کر دونوں پھولے نہ سمائے۔ ایک تو جان پہچان کے آدمی۔ پھر عالی خاندان۔ لڑکا ذہین اور تعلیم یافتہ موروثی جائداد کثیر۔ اگر ان سے ناطہ ہو جائے تو کیا پوچھنا چٹ پٹ باقاعدہ طور پر پیغام کہلا بھیجا۔ اس طرح اتفاقات نے آج اس زہریلے درخت کا بیج بو دیا جس نے تیس ہی برس میں تمام خاندان کا خاندان تباہ کر دیا۔ مستقبل ہماری نگاہوں سے کیسا پوشیدہ رہتا ہے۔

جوں ہی پیغام پہنچا پریم وتی پھولی نہ سمائی۔ ساس نند اور بہو میں چہلیں ہونے لگیں

بہو۔ (چندرا) کیوں اماں کیا آپ اسی سال بیاہ کریں گی؟

پریموتی۔ اور کیا۔ تمہارے لالہ جی کے ماننے کی دیر ہے۔

بہو۔ کچھ تلک جہیز بھی ٹھہرا؟

پریموتی۔ تلک جہیز ایسی لڑکیوں کے لئے نہیں ٹھہرایا جاتا۔ جب ترازو میں لڑکی لڑکے کے برابر نہیں ٹھہرتی تب جہیز کا پاسنگ بنا کر اسے برابر کر دیتے ہیں۔ ہماری برج رانی کملا سے بہت بھاری ہے۔

سیوتی۔ کچھ دنوں گھر میں خوب چہل پہل رہے گی۔ بھابی گیت گائیں گی۔ میں ڈھولک بجاؤں گی۔ کیوں بھابی؟

چندرا۔ مجھے ناچنا گانا نہیں آتا؟

چندرا کی آواز بھاری تھی۔ جب گاتی تو راگ میں بےسرا پن آ جاتا۔ اس لئے اسے گانے سے چڑ تھی۔

سیوتی - یہ تو تم آپ ہی کہو۔ تمہارے گانے کی سنسار میں دُھوم ہے۔

چندرا جل گئی۔ جھینپی ہو کر بولی :- "جیسے ناچ گا کر دوسروں کو لبھانا ہو تو ناچنا گانا سیکھے"

سیوتی - تم ذرا سی دل لگی میں ناراض ہو جاتی ہو - ذرا وہی گیت گاؤ۔ "تم تو شیام بڑے بے کھبر ہو" - اسوقت سننے کو بہت جی چاہتا ہے۔ مہینوں سے تمہارا گانا نہیں سُنا۔

چندرا - نہیں گاؤ۔ تمہارا گلا کوئلوں کا سا ہے

سیوتی - لے اب تمہاری یہی شرارت اچھی نہیں لگتی۔ میری بھابی ذرا گاؤ۔

چندرا - میں اسوقت ہرگز نہ گاؤں گی۔ کیا مجھے کوئی ڈومنی مقرر کیا ہے؟۔

سیوتی - میں تو بلا گیت سُنے آج تمہارا پیچھا نہ چھوڑونگی

سیوتی کی آواز نہایت دلکش اور سُریلی تھی۔ خدو خال بھی دلفریب۔ چمپئی رنگ رسیلی آنکھیں۔ پیازی رنگ کی ساڑی اس پر خوب کھل رہی تھی۔ آپ ہی آپ گانے لگی:-

تم تو شیام بڑے بے کھبر ہو
تم تو شیام .....
آپ تو شیام پیو دودھ کے کلھڑ
میری تو پانی پر گجر۔ پانی پر گجر
تم تو شیام .....

دودھ کے کلھڑ پر بے اختیار ہنس پڑی۔ سیوتی بھی مُسکرائی۔ مگر چندرا رُہانسی ہو گئی۔ بولی۔ "یہ ہنسی کی ہنسی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

سیوتی ۔ آؤ ہم تم ملکر گائیں۔
چندرا ۔ کوئل اور چیل کا کیا ساتھ۔
سیوتی ۔ غصہ تمہاری ناک پر رہتا ہے۔
چندرا ۔ تو ہمیں کیوں چھیڑتی ہو؟ ہمیں گانا نہیں آتا۔ تو کوئی تم سے شکایت کرنے تو نہیں جاتا۔

"کوئی" کا اشارہ رادھا چرن کی طرف تھا۔ چندرا میں چاہے اور کوئی گن نہ ہو مگر شوہر کی خدمت دل و جان سے کرتی تھی۔ انکا ذرا سر دھمکا اور اسکی جان نکلی انکو گھر آنے میں ذرا دیر ہوئی اور یہ بیقرار ہونے لگی۔ جب سے وہ رڑکی چلے گئے۔ تب سے چندرا کا ہنسنا بولنا سب چھوٹ گیا۔ اسکی خوشی انکے ساتھ چلی گئی تھی۔ انہیں باتوں نے رادھا چرن کو بیوی کا شیدا بنا دیا تھا۔ حسن اور سلیقہ اور گن یہ سب محبت کے مقابلے میں بہت ارزاں چیزیں ہیں۔ محبت حسن اور سلیقہ اور گن کی سب خامیاں پوری کر دیتی ہے
سیوتی ۔ شکایت کیوں کریگا کوئی۔ تو تم پر دل و جان سے ریجھا ہوا ہے۔
چندرا ۔ ادھر کئی دن سے خط نہیں آیا۔
سیوتی ۔ تین چار دن ہوئے ہونگے۔
چندرا ۔ تم سے ہاتھ پیر جوڑ کے ہار گئی۔ تم لکھتی ہی نہیں۔
سیوتی ۔ اب وہی باتیں روز روز کون لکھے۔ کوئی نئی بات ہو تو لکھنے کا جی چاہے۔
چندرا ۔ آج شادی کا حال لکھ دینا۔ لاؤں قلم دوات۔
سیوتی ۔ مگر ایک شرط پر لکھونگی۔
چندرا ۔ بتاؤ۔

سیوتی۔ تمہیں شام والا گیت گانا پڑیگا۔
چندرا۔ اچھا گادونگی۔ ہنسنے ہی کا جی چاہتا ہے نا، ہنس لینا۔
سیوتی۔ پہلے گا دو تو لکھوں۔
چندرا۔ نہ لکھوگی۔ پھر باتیں بنانے لگوگی۔
سیوتی۔ تمہاری قسم لکھدونگی۔ گاؤ۔
چندرا گانے لگی۔

تم تو شیام پیو دودھ کے کلہڑ میری تو پانی پے گجر۔ پانی پے گجر ہو۔
تم تو شیام بڑے بے کھبر ہو۔

آخری الفاظ کچھ اس بے سرے پن سے نکلتے تھے کہ ہنسی کا ضبط کرنا محال تھا۔ سیوتی نے بہت روکا مگر ہنسی نہ رک سکی۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑگئے۔
چندرا نے دوسرا بند گایا۔

آپ تو شیام رکھیں دو دو لغیاں، میری تو آنکھی پلے بجر۔ اپنی پلے بجر ہو
تم تو شیام ....

لغیاں پر سیوتی ہنستے ہنستے لوٹ گئی۔ چندرا نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ اب تو خوب ہنس چکیں۔ لاؤں قلم دوات؟۔
سیوتی۔ نہیں نہیں۔ ابھی ذرا ہنس لینے دو۔
سیوتی ہنس ہی رہی تھی کہ بابو کملا چرن باہر سے تشریف لائے۔ پندرہ سولہ برس کا سن تھا۔ گورا گورا رنگ۔ چھریرا بدن۔ خوشرو چہو زرد۔ پرتکلف پوشاک زیب تن کئے۔ عطر میں بسے۔ آنکھوں میں سرمہ۔ لبوں پر مسکراہٹ اور ہاتھ میں بلبل۔ آکر چارپائی پر بیٹھ

گئے۔ سیوتی بولی کملو منہ میٹھا کراؤ تو تمہیں خوشخبری سنائیں۔ سنتے ہی پھڑک اٹھو۔
کملا۔ منہ تو تمہارا آج ضرور ہی میٹھا ہوگا۔ چاہے خوشخبری سناؤ یا نہ سناؤ۔ آج اس شیر
نے وہ میدان مارا ہے کہ بایدوشاید۔
یہ کہکر کملا جان نے بلبل کو انگوٹھے پر بٹھا لیا۔
سیوتی۔ میری خبر سنتے ہی ناچنے لگو گے۔
کملا۔ تو بہتر ہے آپ نہ سنائیے۔ میں تو آج یوں ہی ناچ رہا ہوں۔ اس شیر نے آج ناک رکھ
لی۔ سلما شہود نگ رہ گیا۔ نواب منتخب خاں بہت دنوں سے اینجانب کی آنکھوں پر چڑھے ہوئے
تھے۔ ایک مہینہ ہوتا ہے میں اُدھر سے نکلا تو آپ فرمانے لگے میاں کوئی پٹھا تیار ہو تو لاؤ دو دو
چونچیں ہو جائیں۔ یہ کہہ کر آپ نے اپنا پالا بلبل دکھایا۔ میں نے عرض کیا۔ بندہ نواز۔
ابھی تو نہیں مگر ایک مہینہ میں انشاءاللہ آپ سے ضرور ایک جوڑ ہوگی اور بد بد کر۔ آج آغا
شیر علی کے اکھاڑے میں بدان کی ٹھہری۔ پچاس پچاس روپیہ کی بازی تھی۔ لاکھوں آدمی جمع
تھے۔ نواب صاحب کا بلبل جہانگیر تو یقین مانو سیوتی کمبخت کبوتر کے برابر تھا۔ مگر جس وقت
یہ پٹھا چلا ہے تو اسکی اٹھی ہوئی گردن مستانہ چال اور گٹھیلے پن پر لوگ واہ واہ کرنے لگے۔ جاتے
ہی جاتے اس نے اسکا ٹیٹوا لیا۔ مگر وہ بھی محض پھلا نہ تھا۔ سارے شہر کے بلبلوں کو سر کیے
ہوئے۔ زور سے لات چلائی اس نے خالی دی اور پھر جھپٹ کر اسکی چونچ دبائی۔ اس نے پھر
چوٹ کی۔ یہ نیچے آیا۔ جو طرفہ غل مچ گیا۔ مارا مارا لیا۔ تب تو اینجانب کو بھی غصہ آیا۔ ڈپٹ
کر جو للکارتا ہوں تو یہ اوپر اور وہ نیچے دبا ہوا۔ پھر تو اس نے ہزار ہزار سر پٹکا کہ اوپر آجائے
مگر اس شیر نے ایسا دابا کہ سر نہ اٹھانے دیا۔ نواب صاحب خود موجود تھے۔ بہت چیخے
چلائے مگر کیا ہو سکتا ہے۔ اس نے اسے ایسا دبوچا تھا جیسے باز پدی کو۔ آخر کمبخت بگٹٹ

بھاگا۔ اُس نے پانی کے اُس سرے تک پیچھا کیا مگر نہ پا سکا لوگ حیرت سے دنگ رہ گئے۔ نواب صاحب کا تو چہرہ فق ہو گیا۔ ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ روپیہ ہارنے کی تو انہیں کچھ پروا نہیں لاکھوں کی آمدنی ہے مگر شہر میں جو اُنکی دھاک بندھی ہوئی تھی وہ جاتی رہی روتے ہوئے گھر کو سدھارے۔ سُنتا ہوں یہاں سے جاتے ہی پہنچے بلبل کو زندہ دفن کر دیا۔

یہ کہہ کر کملا چرن نے جیب کھنکھنائی۔

سیوتی۔ تو پھر کھڑے کیا کر رہے ہو۔ آگرہ والے کی دکان پر آدمی بھیجو۔

کملا۔ تمہارے لئے کیا لاؤں بھائی؟

سیوتی۔ مگدھے کے کلھڑ۔

کملا۔ اور بھیّا کے لئے؟

سیوتی۔ دو دو لُغیاں۔

یہ کہہ کر دونوں قہقہے لگانے لگے

———— ⁂ ————

سردھری محبت کو بھلا نہیں سکتی

سُشیلا دل وجان سے شادی کی تیاریوں میں مصروف ہوگئی۔ صبح سے شام تک شادی ہی کے دھندوں میں اُلجھی رہتی۔ سوشیلا لونڈی کی طرح اُسکے حکم کی تعمیل کیا کرتی۔ منشی سجیون لال صبح سے شام تک بازار کی خاک چھانتے پھرتے اور برجن جسکے لئے یہ سب تیاریاں ہو رہی تھیں اپنے کمرہ میں بیٹھی ہوئی رات دن رویا کرتی تھی۔ کسی کو اتنی فرصت بھی نہ تھی کہ دم بھر کو اس کا دل بہلائے۔ یہانتک کہ پرتاپ بھی اب اُسکی صورت سے بیزار نظر آتا۔ وہ بہت اداس رہتا تھا۔ سویرے کا نکلا ہوا شام کو گھر آتا اور اپنی مسہری پر چپ چاپ جا بیٹھتا۔ برجن کے گھر جانے کی تو اُس نے قسم ہی کھالی تھی۔ بلکہ جب کبھی وہ آتی ہوئی دکھائی دیتی تو چپکے سے سرک جاتا۔ یا اگر کہیں اُسکے سامنے بیٹھتا بھی تو کچھ اس طرح منہ پھیر لیتا اور ایسی خشکی سے پیش آتا کہ برجن رونے لگتی اور سُشیلا سے جاکر کہتی۔ چچی للو مجھ سے ناراض ہیں۔ میں بلاتی ہوں نہیں بولتے۔ تم چلکر منا دو۔ یہ کہہ کر وہ مچل جاتی اور سُشیلا کا آنچل پکڑ کر کھینچتی ہوئی پرتاپ کے گھر لاتی۔ جیسے کوئی فریادی اپنے حامی کو ساتھ لائے۔ مگر پرتاپ دونوں کو دیکھتے ہی نکل بھاگتا۔ برج رانی دروازہ تک اسکے پیچھے پیچھے یہ کہتی ہوئی آتی۔ کہ للو ذرا سُن لو۔ ذرا سُن لو۔ تمہیں ہماری قسم ذرا سُن لو۔ مگر جب وہ نہ سُنتا اور نہ منہ پھیر کر دیکھتا تو بیچاری لڑکی زمین پر بیٹھ جاتی اور خوب پھوٹ پھوٹ کے روتی اور کہتی۔ یہ مجھ سے کیوں روٹھے ہوئے ہیں میں

نے تو انہیں کبھی کچھ نہیں کہا۔ سُبا ما اسے سینے سے لگا لیتی اور سمجھاتی بیٹی جانے دو۔ للو پاگل ہو گیا ہے۔ اُسے بیٹے کی اس سرد مہری کا اندازہ معلوم ہو چلا تھا۔

آخر شادی کو صرف پانچ دن رہ گئے۔ عزیز و اقارب دور و نزدیک سے آنے لگے۔ برجن کو باہر نکلنے کی ممانعت ہو گئی۔ کنگن بندھ گیا۔ آنگن میں خوبصورت منڈوا چھا گیا۔ یہ کچے دھاگے کا کنگن پاک فرائض کی ہتکڑی ہے جو کبھی ہاتھ سے نہ نکلے گی۔ اور یہ منڈوا اس محبت و شفقت کے سایہ کی یادگار رہے جو مرتے دم تک سر سے نہ اُٹھے گا۔ آج شام کو سُبا ما سو سیلا۔ مہراجنیں سب کی سب ملکر دیوی جی کی پوجا کرنے گئیں۔ مہریاں اپنے دھندوں میں لگی ہوئی تھیں۔ برجن گھبرا کر اپنے کمرے سے نکلی اور پرتاپ کے گھر آ پہنچی۔ چو طرفہ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف پرتاپ کے کمرے میں دُھندلی روشنی کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ برجن کمرہ میں داخل ہوئی تو کیا دیکھتی ہے کہ میز پر لیمپ روشن ہے اور پرتاپ ایک کھری چارپائی پر پڑا سو رہا ہے۔ دُھندلی روشنی میں اُس کا چہرہ بہت پژمردہ اور مغموم نظر آتا تھا۔ چیزیں سب اِدھر اُدھر بے قرینہ پڑی ہوئی ہیں۔ فرش پر منوں گرد جمع ہو گئی ہے۔ کتابیں بکھری ہوئی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کمرہ کو کسی نے مہینوں سے نہیں کھولا۔ یہ وہی پرتاپ ہے جو صفائی پر جان دیتا تھا۔ برجن نے چاہا اُسے جگا دوں۔ مگر پھر کچھ سوچکر زمین سے کتابیں اُٹھا اُٹھا الماریوں میں رکھنے لگی۔ میز پر سے گرد جھاڑی۔ تصویروں کے مُنہ پر سے گرد کی نقاب اُٹھائی۔ دفعتاً پرتاپ نے کروٹ بدلی۔ اور اُسکی زبان سے یہ الفاظ نکلے:۔ "برجن میں تمہیں نہیں بھول سکتا"۔ پھر ذرا دیر کے بعد "برجن! برجن!! کہاں جاتی ہو یہیں بیٹھو"۔ پھر کروٹ بدلکر "نہ بیٹھو گی۔ اچھا جاؤ۔ میں تم سے نہ بولونگا"۔ پھر ذرا ٹھہر کر۔ "اچھا جاؤ دیکھیں کہاں جاتی ہو"۔ یہ کہہ کر وہ لپکا جیسے کسی

بھاگتے ہوئے آدمی کو پکڑ رہا ہو۔ برجن کا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں آگیا۔ اس کے ساتھ ہی آنکھیں کھُل گئیں۔ ایک منٹ تک اُس کی بے معنی نگاہیں برجن کے چہرہ پر گڑی رہیں۔ پھر چونک کر اُٹھ بیٹھا۔ اور برجن کا ہاتھ چھوڑ کر بولا۔ "تم کب آئیں برجن: میں ابھی تمہارا خواب دیکھ رہا تھا"

برجن نے بولنا چاہا مگر گلا رُندھ گیا۔ اور آنکھیں بھر آئیں۔ پرتاپ نے اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر پھر کہا۔ "کیا یہ سب تم نے صاف کیا۔ تمہیں بڑی تکلیف ہوئی"

برجن نے اس کا بھی کچھ جواب نہ دیا۔

پرتاپ۔ برجن۔ تم مجھے بھول کیوں نہیں جاتیں؟

برجن نے پُرنم آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ "کیا تم مجھے بھول گئے؟

پرتاپ نے نادم ہو کر سر جھکا لیا

تھوڑی دیر تک دونوں خیالات سے بھرے زمین کی طرف تکتے رہے پھر برجن نے پوچھا۔ "تم مجھ سے کیوں ناراض ہو میں نے کوئی خطا کی ہے؟"

پرتاپ ۔ نہ جانے کیوں اب تمہیں دیکھتا ہوں۔ تو جی چاہتا ہے۔ کہ کہیں چلا جاؤں۔

برجن ۔ کیا تم کو میری ذرا بھی محبت نہیں معلوم ہوتی۔ میں دن بھر رویا کرتی ہوں۔ تمہیں مجھ پر ترس نہیں آتا۔ تم مجھ سے بولتے تک نہیں۔ بتلاؤ میں نے تمہیں کیا کہا کہ تم اتنا رُوٹھ گئے۔

پرتاپ ۔ میں تم سے روٹھا تھوڑے ہی ہوں۔

برجن ۔ تو مجھ سے بولتے کیوں نہیں؟

پرتاپ۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں بھول جاؤں تم امیر ہو۔ تمہارے ماں باپ امیر ہیں۔ میں یتیم ہوں۔ میرا تمہارا کیا ساتھ؟

برجن۔ اب تک تو تم نے کبھی یہ حیلہ نہیں نکالا تھا۔ کیا اب میں زیادہ امیر ہو گئی؟

یہ کہہ کر برجن رونے لگی۔ پرتاپ بھی پسیجا۔ بولا۔ "برجن ہمارا تمہارا بہت دنوں تک ساتھ رہا۔ اب بچھڑنے کے دن آ گئے۔ چند دن میں تم یہاں والوں کو چھوڑ کر اپنے سسرال چلی جاؤ گی۔ اس وقت مجھے ضرور ہی بھول جاؤ گی۔ اس لئے میں بھی چاہتا ہوں تمہیں بھول جاؤں۔ مگر کتنا ہی چاہتا ہوں کہ تمہاری باتیں یاد نہ آئیں۔ وہ نہیں مانتیں۔ ابھی سوتے سوتے تمہارا ہی سپنا دیکھ رہا تھا۔

ڈپٹی شیاما چرن کا مکان آج حسینوں کے جمگھٹ سے اندر کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ سیوتی کی چار سہیلیاں رکمنی، سیتا، رام دیئی، چندر کنور سولہوں سنگار کئے اٹھلاتی پھرتی تھیں۔ ڈپٹی صاحب کی بہن جانکی کنور بھی اپنی دو لڑکیوں کے ساتھ آرہ سے آگئی تھیں۔ ان دونوں کا نام کملا اور اما دیئی تھا۔ کملا کا بیاہ ہو چکا تھا۔ اما دیئی ابھی کنواری تھی۔ دونوں آفتاب و مہتاب منڈپ کے تلے ڈومنیاں اور گائنیں سہاگ اور سہرا لاپ رہی تھیں گلبیا نائن اور جمنی بارن دونوں شوخ رنگ کی ساڑیاں پہنے، مانگ سیندور سے بھروائے، گلٹ کے کڑے پہنے چھم چھم کرتی پھرتی تھیں۔ گلبیا شوخ و شنگ اور نوجوان تھی۔ جمنی کا سن ڈھل چکا تھا سیوتی کا کیا پوچھنا آج اس پر غضب کا نکھار تھا۔ بیلی آنکھیں فرط مسرت سے متوالی ہو رہی تھیں اور گلابی ساڑی کی جھلک سے چمپئی رنگ گلابی نظر آتا تھا۔ دھانی مخمل کی کرتی اس پر خوب کھلتی تھی ابھی نہا کر آئی تھی اسلئے ناگن کی سی لٹیں شانوں پر لہرا رہی تھیں۔ چھیڑ چھاڑ اور چہل سے اتنی فرصت بھی ملتی تھی کہ ذرا بال گوندھ لے۔ گہنے باہر سنار صاف کر رہا تھا۔ ہاتھوں میں صرف کڑے تھے۔ یہ سادگی اُس پر ہزار زیوروں سے زیادہ زیب دیتی تھی۔ مہراجن کی بیٹی مادھوری چھینٹ کا لچکے دار لہنگا پہنے۔ آنکھوں میں کاجل لگائے انلیبا ہر ایک کئے ہوئے تھی۔

رکمنی نے سیوتی سے کہا۔ "ستو تمہاری بھاوج کہاں ہیں، دکھائی نہیں دیتیں کیا ہم لوگوں سے بھی پردہ ہے؟"

رام دیئی۔ (مسکرا کر) پردہ کیوں نہیں ہماری نظر نہ لگجائیگی۔
سیوتی۔ کمرہ میں پڑی سو رہی ہونگی دیکھو ابھی کھینچے لاتی ہوں۔
یہ کہہ کر وہ چندرا کے کمرہ میں پہنچی۔ وہ ایک معمولی سی ساڑی پہنے۔ چارپائی پر پڑی دروازہ کی طرف ٹکٹکی لگائے ہوئے تھی۔ اسے دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھی۔ سیوتی نے کہا "یہاں کیا پڑی ہو۔ اکیلے تمہارا جی نہیں گھبراتا؟
چندرا۔ اونھ۔ کون جائے۔ ابھی کپڑے نہیں بدلے۔
سیوتی۔ تو بدلتی کیوں نہیں سکھیاں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔
چندرا۔ ابھی میں نہ بدلونگی۔
سیوتی۔ یہ ضد اچھی نہیں لگتی۔ سب اپنے دل میں کیا کہتی ہونگی؟
چندرا۔ تم نے تو چٹھی پڑھی تھی۔ آج ہی آنے کو لکھا تھا؟
سیوتی۔ اچھا تو یہ ان کا انتظار ہو رہا ہے۔ یہ کہیئے جبھی یہ جوگ سادھا ہے
چندرا۔ دوپہر تو ہوئی شاید اب نہ آئیں گے۔
اتنے میں کملا اور اُما دیئی دونوں طرارے بھرتی آپہنچیں۔ چندرا نے گھونگھٹ نکال لیا اور فرش پر آبیٹھی۔ کملا اُس کی بڑی نند ہوتی تھی
کملا۔ ارے۔ ابھی تو انہوں نے کپڑے بھی نہیں بدلے۔
سیوتی۔ بھیا کی باٹ جوہ رہی ہیں۔ اسی لئے یہ بھیس رچا ہے
کملا۔ پاگل ہیں۔ انہیں غرض ہوگی آپ آئیں گے۔
سیوتی۔ ان کی دنیا نرالی ہے۔
کملا۔ مردوں کی محبت چاہے کتنی ہی کرے مگر زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکالے نہیں تو

وہ شیر ہو جاتے ہیں۔ خواہ مخواہ ستانے اور جلانے لگتے ہیں۔ اگر تم اُن کی کچھ پروا نہ کرو۔ اُن سے
سیدھے منہ بات نہ کرو تو تمہاری ہر طرح خاطر کریں گے۔ تم پر جان واریں گے۔ مگر جلد ہی
انہیں معلوم ہوا کہ اب اس کے دل میں میری جگہ ہو گئی ہے۔ بس اُسی دن سے اُن کی نگاہ پلٹ جائیگی
سیر کو جائینگے تو خواہ مخواہ دیر کر کے آئینگے۔ کھانے بیٹھیں گے تو منہ جُھٹا کر کے اُٹھ جائینگے
بات بات پر روٹھیں گے۔ تم روٹھو گی تو منائیں گے۔ اور دل میں خوش ہونگے کہ کیسا اُسکا پھلانا
ہے۔ تمہارے سامنے دوسری عورتوں کی تعریف کرینگے۔ غرض تمہیں جلانے میں انہیں مزا آنے لگیگا
اب میرے ہی گھر میں دیکھو پہلے اتنی خاطر کرتے تھے کہ کیا بتاؤں۔ ہر دم نوکروں کی طرح ہاتھ
باندھے حاضر۔ پنکھا جھلنے کو موجود۔ ہاتھ سے لقمہ کھلانے کو موجود۔ یہاں تک کہ (مسکرا کر) مجھے
دبلانے سے بھی عار نہ تھا۔ بات منہ سے نکلی نہیں اور پوری ہوئی۔ میں اس وقت انیلی تھی۔ مردوں
کے داؤں پیچ کیا جانوں۔ دم میں آ گئی سیوتی جھوٹ نہ مانتا اُسی دن سے اُنکی آنکھ بدل گئی۔
لگے سیر سپاٹا کرنے۔ ایک روز روٹھ کر چلدئے۔ آدھی رات کو گجرا گلے میں ڈالے عطر میں
بسے ہوئے گھر آئے۔ بچہ سمجھتے تھے کہ آج ہاتھ باندھ کر کھڑی ہونگی۔ میں نے لمبی تانی تو
رات بھر کروٹ نہ بدلی۔ دوسرے دن بھی نہ بولی۔ آخر اللہ جی آئے۔ پیروں پر گرے۔
گڑگڑائے۔ تب سے میں نے یہ بات گرہ باندھ لی ہے کہ مردوں سے کبھی محبت نہ جتاؤ۔
سیوتی۔ جیجا کو میں نے دیکھا ہے۔ بھیا کی شادی میں آئے تھے۔ بڑے ہنس مکھ آدمی ہیں۔
کملا۔ پاربتی ان دِنوں پیٹ میں تھی اسی سے میں نہ آ سکی تھی۔ یہاں سے گئے تو لگے تمہاری تعریف
کرنے۔ تم کبھی پان دینے گئی تھیں۔ کہتے تھے کہ میں نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔ اور
خوب خوب باتیں ہوئیں۔
سیوتی۔ (مسکرا کر) جھوٹے ہیں زمانہ کے۔ لباڑیے۔ بات یہ ہوئی کہ گلابیا اور جمنی دونوں کسی

کام سے باہر گئی ہوئی تھیں۔ اماں نے کہا یہ کھا کے گئے ہیں۔ پان بنا کے دے آ۔ میں پان لیکر گئی۔ چارپائی پر لیٹے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ بیٹھے۔ میں نے پان دینے کو ہاتھ بڑھایا۔ تو آپ نے کلائی پکڑ لی اور کہنے لگے کہ ایک بات سُن لو۔ ایک بات سُن لو مگر میں ہاتھ چھڑا کر بھاگی۔

کملا۔ نکلی نہ جھوٹی بات۔ وہی تو میں بھی کہوں کہ ابھی گیارہ بارہ برس کی چھوکری۔ اُس نے اُن سے کیا باتیں کی ہونگی مگر نہیں اپنی ہی ضد کئے جائیں۔ مرد بڑے ڈینگئے ہوتے ہیں۔ میں نے یہ کہا میں نے وہ کہا۔ میرا تو ان باتوں سے جی جلتا ہے۔ نہیں معلوم انہیں اپنے اوپر جھوٹی تہمت لگانے میں کیا مزا آتا ہے۔ آدمی جو بُرا بھلا کرتا ہے اس پر پردہ ڈالتا ہے مگر یہ لوگ کرینگے تو تھوڑا اور ڈینگ مارنے کو ہر دم تیار ہیں تو جب اُنکی ایک بات بھی سچ نہیں مانتی۔

اتنے میں گلبیا نے آکر کہا "تم تو یہاں ٹھاڑھی تیلاتی ہو اور تمہاری سکھی تمکا آنگن میں بلوتی ہیں۔

سیوتی۔ دیکھو بھابی اب دیر نہ کرو۔ گلبیا! ان کے صندوق سے کپڑے تو نکال لے۔

کملا چندرا کا سنگار کرنے لگی سیوتی سہیلیوں کے پاس آئی رُکمنی بولی "واہ بہن خوب! وہاں جا کر بیٹھ رہیں۔ تمہاری دیوا اور دل سے ہنسیں بولیں کیا؟"

سیوتی۔ کملا بہن چلی گئیں اُن سے بات چیت ہونے لگی۔ دونوں آرہی ہیں"

رُکمنی۔ لڑکوں ہیں نہ

سیوتی۔ تین ہوئے تھے۔ ایک پار سال مر گیا۔ دو موجود ہیں۔

رام دیئی۔ مگر کاٹھی بہت اچھی ہے

چندا کنور۔ مجھے اُن کا بانک بہت پسند آیا جی چاہتا ہے چھین لوں۔

سیتا۔ بانک واقعی بہت اچھی ہے۔ دونوں بہن ایک سے ایک بڑھکر ہیں۔

رُکمنی۔ آ گئی طبیعت۔ اُمادیئی مرد نہ ہوئیں نہیں تو تم جان دینے لگتیں۔

سیتا۔ دوسروں پر تو وہ جان دے جس کا دولہا کمرو ہو۔ یہاں تو لاکھ دو لاکھ میں ایک ہے۔

(رُکمنی کے شوہر ذرا رنگ کے گہرے تھے اور نقشہ بھی سڈول نہ تھا۔)

رُکمنی۔ صورت لیکر چاٹی نہیں جاتی۔

سیتا۔ وہ تو دل ہی جانتا ہوگا۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ چاہے روکھی روٹی کھانے کو ملے۔ جھونپڑے میں رہنا پڑے مگر صورت دیکھتے ہی سب دُکھ دُور ہو جاتا ہے یہ نہیں کہ جھنگی صورت دیکھ کر بخار چڑھ آئے۔ جی متلانے لگے۔

سیوتی۔ سیتا کو ایشور نے بر اچھا دیا ہے۔ اُس نے سونے کی گو پُوجی تھی۔

رُکمنی۔ (جلکر) گورے چمڑے سے کچھ نہیں ہوتا۔

سیتا۔ تمہیں کالا ہی پسند ہوگا۔

سیوتی۔ مجھے کالا بر ملتا تو زہر کھا لیتی۔

رُکمنی۔ یُوں کہنے کو جو چاہے کہہ لو مگر سچ پُوچھو تو آرام کالے ہی دولہا سے ملتا ہے۔

سیوتی۔ آرام نہیں خاک ملتا ہے۔ گھن سا آکے لپٹ جاتا ہوگا۔

رُکمنی۔ یہی تو تمہاری لڑکپن کی باتیں ہیں۔ تم جانتی نہیں خوبصورت مرد ہمیشہ اپنے ہی بناؤ سنگار میں لگا رہتا ہے۔ اُسے اپنے آگے بیوی کا کچھ خیال نہیں رہتا۔ اگر عورت بیحد خوبصورت ہے تو خیر ورنہ تھوڑے ہی دنوں میں وہ اس سے بھاگنے لگتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں ایسی دوسری عورتوں کے دل پر آسانی سے قابو پا سکتا ہوں۔ بیچارہ کالا کمرو آدمی خوبصورت بیوی پا جاتا ہے تو سمجھتا ہے مجھے ہیرے کی کھان مل گئی۔

صورت لکی کسر وہ پیار اور خاطر داری سے پوری کرتا ہے۔ اُسکے دل کو ہمیشہ یہ دغدغہ لگا ہے کہ میں ذرا بھی اس سے ترش ہوا تو وہ مجھ سے نفرت کرنے لگیگی ہیں اگر آدھی رات کو کہوں کہ گرم گرم حلوہ کھلاؤ تو ممکن نہیں کہ اسی وقت حکم کی تعمیل نہ کریں۔ آج کسی گہنے کی فرمائش کرونں تو کل بنواکر حاضر کریں۔

چندر کنور۔ دولہا سب سے اچھا وہ جو منہ سے بات نکلتے ہی پوری کرے۔

رام دیئی۔ تم اپنی بات نہ چلاؤ۔ تمہیں تو اچھے اچھے گہنوں سے سروکار ہے۔ دولہا کیسا ہی ہو۔

سیتا۔ نہیں معلوم کوئی اپنے مرد سے کسی چیز کی فرمائش کیونکر کرتا ہے کیا لحاظ نہیں معلوم ہوتا۔

رکمنی۔ تم بیچاری کیا فرمائش کروگی۔ کوئی بات تو پوچھے

سیتا۔ میرا تو انہیں دیکھ ہی کے جی بھر جاتا ہے گہنے کپڑے کی طرف طبیعت نہیں جاتی۔

سیونتی۔ سیتا کا خوب جوڑ ہے۔

رام دیئی۔ جوڑ جو سچ پوچھو تو چندر کنور اور کلونت رائے کا خوب ہے۔

سیونتی۔ یہ انہیں دبائی ہونگی تو بیچارے گھگھیانے لگتے ہونگے۔

چندر کنور بھاری بھرکم گداز جسم کی نازنین تھی۔ کلونت رائے منحنی اور ضعیف القامت تھے۔

رام دیئی۔ اپنی قسمت کو کوستے ہونگے کہ ایسی دیئی کہاں سے پائی۔

چندر کنور۔ جب دیکھو بدہضمی کی شکایت۔ دو چپاتیاں کھائیں جب بھی بدہضمی ذرا سا دودھ پیئیں جب بھی بدہضمی۔ ناک میں دم ہے۔

سیونتی۔ بیچارے تم سے ڈرتے ہونگے۔

سیتا۔ اُن کے سامنے بچے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ چاہیں تو اُنہیں گود میں کھلائیں۔

رکمنی (جلکر) بس سارے زمانے میں ایک تم اچھی اور ایک تمہارا دولہا۔ باقی سب بے جوڑ۔ انمل

سیتا۔ تمہیں کاہے کو کڑوا لگتا ہے۔

اتنے میں ایک اور نازنین جلوہ افروز ہوئی۔ گہنے سے گوندنی کی طرح لدی ہوئی۔ پُرتکلف جوڑا پہنے عطر میں بسی۔ مُرمسی سے لبیس آنکھوں سے شوخی و شرارت برس رہی تھی۔

رام دئی۔ آؤ رانی آؤ۔ تمہاری ہی کسر تھی۔

رانی۔ کیا کروں نگوڑی نائن سے کسی طرح پیچھا ہی نہ چھوٹتا تھا۔ کلثوم کی ماں آئی تب جا کے جوڑا بندھا۔

سیتا۔ تمہاری جاکٹ پر نچھاور ہونے کو جی چاہتا ہے۔

رانی۔ اس کا قصہ کچھ نہ پوچھو۔ کپڑا دیئے مہینہ بھر ہوا۔ دس بارہ مرتبہ درزی سی کر لایا۔ مگر کبھی آستین ڈھیلی کر دی۔ کبھی بخیہ بگاڑ دیا۔ کبھی چنت خراب کر دی۔ بارے ابھی چلتے چلتے دیگیا ہے۔

سیوتی۔ البیلے بالم ہیں یہیں یا کہیں گئے ہوئے ہیں؟

رانی۔ میری بلا جانے۔ جیسے کتنا گھر رہے ویسے رہے پردیس۔

یہی باتیں ہو رہی تھیں۔ کہ مادھوی غل مچاتی ہوئی آئی۔ بھیا آئے۔ اُن کے ساتھ جیجا بھی ہیں۔ اوہو ہو۔

رانی۔ کیا رادھا چرن آئے ہیں کیا؟

سیوتی۔ ہاں چلو ذرا بھابی کو ستدلیا دے آؤں۔ کیوں رے کہاں بیٹھے ہیں۔

مادھوی۔ اُسی بڑے کمرے میں جیجا پگڑی باندھے ہیں۔ بھیا کوٹ پہنے ہیں۔ مجھے بھیلے نے روپیہ دیا۔ یہ کہہ کر اس نے مٹھی کھول کر دکھائی۔

رانی۔ تو اب منہ میٹھا کراؤ۔

سیوتی۔ کیا میں نے کوئی منت مانی تھی؟
سیتا۔ باچھیں کھلی جا رہی ہیں۔ آنکھوں میں نشہ آ گیا ہے۔
رانی۔ یہ سادگی تم پر خوب پھبتی ہے۔ خاصی پری معلوم ہوتی ہو۔
سیوتی۔ (چندرا کے کمرے میں آ کر بولی) لو بھابی تمہارا شگون ٹھیک اترا۔
چندرا۔ کیا آ گئے۔ ذرا جا کے اندر بلا لو۔
سیوتی۔ ہاں مردانے میں چلی جاؤں۔ تمہارے بہنوئی صاحب بھی تو پڑے ہیں۔
چندرا۔ باہر بیٹھے کیا کر رہے ہیں۔ کسی کو بھیجکر بلا لیتیں۔ نہیں تو دوسروں سے باتیں کرنے لگیں گے۔

یکایک کھڑاؤں کی آواز آئی۔ اور رادھا چرن آتے دکھائی دیئے۔ سن چوبیس پچیس سال سے زائد نہ تھا۔ بہت ہی خوشرو۔ سرخ و سفید۔ انگریزی تراش کے بال۔ فرنچ تراش کی ڈاڑھی کھڑی مونچھیں۔ لیونڈر کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ بدن پر صرف ایک ریشمی مہین کرتا تھا۔ آ کر چارپائی پر بیٹھ گئے اور سیوتی سے بولے "کیوں ستو ہفتہ بھر سے خط نہیں بھیجا۔"

سیوتی۔ میں نے سوچا اب تو آ ہی رہے ہو۔ کیا خط بھیجوں۔

یہ کہہ کر سیوتی وہاں سے کھسک گئی۔ چندرا نے گھونگھٹ اٹھا کر کہا۔ وہاں جا کر بھول جاتے ہو۔

رادھا چرن۔ (گلے سے لگا کر) جبھی سینکڑوں کوس سے دوڑا چلا آتا ہوں۔

بارات کی رخصتی

بارات دُھوم دھام سے گئی اور تین دن مقیم رہی۔ شب و روز عیش و مسرت کے جلسے ہوتے رہے۔ پہلے دن آدھی رات کے وقت منڈپ کے نیچے شادی کے مراسم ادا کئے گئے۔ تمام باراتی فرش پر بیٹھے۔ برجن ایک شنگرفی رنگ کی ساڑی پہنے۔ لمبا سا گھونگھٹ نکالے آئی اور کملا چرن کے بغل میں بٹھائی گئی۔ ہون ہوا۔ سنسکرت کے شلوک پڑھے گئے۔ جو دولہا دُلہن کے سمجھ میں بالکل نہ آئے۔ عورتوں نے سُہاگ کے گیت گائے۔ پھر دولہا دُولہن نے ہون کنڈ کا سات بار طواف کیا۔ اسکے بعد دولہا کہبیر میں گیا جہاں عورتوں نے اُسے برجن کا جُوٹھا پان کھلایا تاکہ وہ ہمیشہ بیوی کا غلام بنا رہے۔ اُس سے غزل پڑھنے کی فرمائش کی جسکی تعمیل وہ نہ کر سکا۔ پھر اُس کی وضع قطع اور حسب و نسب کی ہنسی اُڑائی۔ اُسکی ماں اور باپ کو اور بہنوں کو خدا معلوم کیسی فحش گالیاں دیں جو دولہا کو ذرا بھی ناگوار نہ معلوم ہُوئیں بلکہ وہ خوش ہو ہو کر سُنتا رہا۔ دوسرے دن دس بجے کلیوا کا رسم ہوا۔ نوشہ مع خاص خاص رشتہ داروں کے آنگن میں بیٹھا۔ باسی پُوریاں اُس کے سامنے ایک طشت میں لائی گئیں۔ منشی [illegible] نے پانچ اشرفیاں تھالی کے پاس رکھدیں اور چمکار کر کہا بیٹا کھاؤ مگر نوشہ نے ہاتھ [illegible] ایا۔ تب ایک سونے کی انگوٹھی ایک دوشالہ جس پر زریں کام بنا ہوا تھا۔ ایک چاندی کا گلاس جو چاندی [illegible] برتن لاکر رکھے گئے۔ تس پر بھی نوشہ نے پوریوں کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا [illegible] نے دھا چرن کی طرف

دیکھ کر کہا۔ بابو صاحب۔ اب آپ کھانے کی اجازت دیجئے۔ بابو صاحب نے مسکرا کر کہا میں نے منع تھوڑا ہی کیا ہے۔ کھاتے کیوں نہیں۔ کملا کھا لو۔ کملا نے بھائی کی طرف دیکھا مگر بجائے اجازت کے ممانعت پائی۔ بسمبیون لال گھر میں گئے۔ ایک موہن مالا اور دو انگوٹھیاں لائے اور پھر نوشہ سے ماحضر تناول فرمانے کی التجا کی۔ رادھا چرن نے کملا سے کہا۔ خاموش کیوں بیٹھے جو کچھ عرض کرنا ہو صاف صاف دیوان صاحب سے کرو۔ کملا کے بہنوئی پران ناتھ نے کہا نوشہ کی طرف سے میں ایک گھوڑے کی درخواست کرتا ہوں منشی جی پھر گھر میں گئے۔ سُبا ما سے کہا یہ لوگ پورے ڈاکو ہیں۔ دو ڈھائی سو ڈکار گئے۔ اب سواری کے لئے گھوڑا مانگتے ہیں۔ سُباما نے جواب دیا گھوڑا مانگتے ہیں گھوڑا دیجئے۔ اُنکی خواہش تو پوری ہو۔ منشی جی نے مجبور ہو کر اپنے ٹمٹم کا گھوڑا دیا۔ تب کملا پرت نے نوالہ اُٹھایا اور گن کر پانچ بار لقمہ مُنہ تک لیگئے۔ شام کے وقت باراتیوں کی دعوت ہوئی۔ تکلف سے کھانا رکھا گیا۔ لوگ کھانے بیٹھے۔ ڈومنیاں اندر گانے لگیں۔

آپ تو لالہ نیوتے میں آئے۔ میّا کیسے دے آئے ارے بہنا کیسے دے آئے

پھوپھی تمہاری مدکی ماتی۔ اُسکو نہ کیوں لے آئے۔ کیسے سونے آئے۔

منشی پیارے لال نے فرمایا پران ناتھ گالیوں کے از حد مشتاق ہیں۔ ڈومنیوں نے دوسرے گیت میں اُن کی خبر لی۔

پران ناتھ بابو تم ہو ابھی نادان

بہن تمہاری بہت سیانی۔ گھر گھر ہوت بکھان۔ تم ہو ابھی نادان

سیج پہ اُس کے نِس دن آتے۔ دس دس سجن سُجان۔ تم ہو ابھی نادان۔

ڈپٹی شیاما چرن نے فرمایا پیارے لال کو کیوں چھوڑتی ہو۔ اِن کی بہن

کا نام چمپا ہے۔ ڈومنیوں نے گایا۔

چمپا تیری کلیاں بہت سہانی۔ رنگ تیرا مجھے بھایا۔ رنگ تیرا مجھے بھایا
تیری صورتیا چیت سے نہ اُترے۔ تو نے مجھے اپنایا۔ رنگ تیرا مجھے بھایا۔

اسی طرح فرمائشیں کر کر کے لوگ گالیاں سنا کئے۔ کوئی بُائی نہ بچا۔ یہاں تک کہ گاتے گاتے ڈومنیوں کا جی اکتا گیا۔ مگر سننے والوں کو سیری نہ ہوئی۔ منشی پیارے لال نے پھر تازہ فرمائش کی۔ ڈومنیوں نے فحش گالیاں دینی شروع کیں۔ آخر آٹھ بجتے بجتے کھانا ختم ہوا۔ تیسرے دن رخصتی کا وقت تھا۔ علی الصبح باراتی اصحاب منڈپ کے نیچے جمع ہوئے۔ منشی سجیون لال اور اُن کے رشتہ دار باراتیوں سے بغلگیر ہوئے۔ نو بجتے بجتے بارات رخصت ہو گئی۔ آئی تھی کس شان سے گئی بالکل اس طرح جیسے کوئی شکست خوردہ فوج۔ گائنوں نے رخصتانے کے گیت گائے۔ منشی شیام لال نے گلی گانے کے لئے ایک اشرفی انعام دی۔ کملا چرن اندر گئے۔ ساس نے چھاتی سے لگایا۔ چلتے وقت پانچ اشرفیاں نذر کیں۔ شادی بڑی خوبی سے انجام کو پہنچی شہر میں چاروں طرف واہ واہ کی دھوم مچ گئی۔

حسد

پرتاپ چند نے برجن کے گھر آنا جانا شادی کے کچھ دن پہلے ہی سے ترک کر دیا تھا۔ شادی کے کسی کام میں نہ شریک ہُوا۔ حتیٰ کہ محفل میں نہ گیا۔ مغموم صورت بنائے مُنہ لٹکائے اپنے کمرہ میں بیٹھا رہا۔ منشی سنجیون لال۔ سوسیلا۔ سُبلا سب خوشامدیں کر کے ہار گئے۔ مگر اُس نے بارات کی طرف رُخ تک نہ کیا۔ آخر میں منشی جی کبیدہ خاطر ہو گئے۔ اور پھر اس نے کچھ نہ کہا۔ یہ کیفیت شادی کے ہونے تک تھی۔ شادی کے بعد سے تو اس نے اُدھر کا راستہ ہی ترک کر دیا۔ مدرسہ جاتا تو اس طرح کترا کر نکل بھاگتا گویا سامنے کوئی شیر بیٹھا ہوا ہے یا جیسے تقاضہ کرنیوالے مہاجن کے سامنے سے مقروض آدمی نظریں بچا کر نکل جاتا ہے۔ برجن کی تو پرچھائیں سے بھاگتا۔ اگر کبھی اُسے اپنے گھر میں دیکھ پاتا۔ تو اندر قدم نہ رکھتا۔ ماں سمجھاتی۔ بیٹا تم برجن سے بولتے چالتے کیوں نہیں۔ کیوں اس سے مُنہ موڑے ہوئے ہو۔ وہ آ آ کر گھنٹوں روتی ہے کہ میں نے کیا کیا کہ جس سے یہ ناراض ہو گئے۔ دیکھو تم اور وہ کتنے دنوں تک ایک ساتھ رہے۔ تم اُسے کتنا پیار کرتے تھے۔ یکایک تم کو کیا ہو گیا۔ اگر تم اسی طرح روٹھے رہے تو غریب لڑکی کی جان پر بن جائیگی۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے۔ ایشور جانتا ہے مجھے اُسے دیکھ کر ترس آتا ہے۔ سوائے تمہارے ذکر کے اُسے جیسے کوئی دوسری بات ہی نہیں معلوم۔ پرتاپ آنکھیں نیچی کئے ہوئے

یہ سب سُنتا اور چپ چاپ سرک جاتا۔
پرتاپ اب کمسن بچہ نہ تھا۔ اُسکی زندگی کے پودے میں شباب کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ اُس نے بہت دِنوں سے۔ اُسیوقت سے جبکہ اُس نے ہوش سنبھالا اپنے طفلانہ خوابوں میں برجن کی زندگی کو اپنی زندگی سے شیر و شکر کی طرح ملالیا تھا اُن دلفریب اور سہانے خوابوں کا اس بیدردی اور بیرحمی سے خاک میں ملایا جانا اس کے نازک دل کو پارہ پارہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ وہ جو اپنے خیال میں برجن کا سب کچھ تھا کہیں کا نہ رہا۔ اور وہ جس نے برجن کو ایک لمحہ کے لئے بھی خیال میں جگہ نہ دی سب کچھ ہوگیا۔ اس خیال سے اس کے دل میں جھنجلاہٹ پیدا ہوتی۔ اور جی چاہتا کہ جن لوگوں نے میرا طلسم خواب یوں توڑا ہے۔ اور میری زندگی کی آرزوئیں یوں مٹی میں ملائی ہیں انہیں میں بھی جلاؤں اور سلگاؤں۔ سب سے زیادہ غصّہ اُسے جس پر آتا وہ غریب سوسیلا تھی۔ رفتہ رفتہ اُس کی یہ حالت ہوگئی کہ جب مدرسے سے آتا تو کملاچرن کے متعلق کوئی نہ کوئی روایت منود بیان کرتا۔ خصوصاً اسوقت جبکہ سوسیلا بیٹھی ہوتی۔ اس غریب کا دل دُکھانے میں اُسے خاص مزہ آتا اگرچہ جھوٹ بولنے کی اُسے عادت نہ تھی۔ جو کچھ وہ کہتا وہ حقیقت ہوتی تھی۔ مگر دانستہ طور پر اُس کا طرز بیان اور انداز تقریر کچھ ایسا دلخراش ہوجاتا کہ سوسیلا کے جگر میں تیر کی طرح چُبھ جاتا۔ آج میاں کملاچرن تپائی کے اوپر کھڑے تھے۔ سر آسمان سے باتیں کرتا تھا۔ مگر بھیا اتنے بڑے کہ جب میں نے ان کی طرف اشارہ کیا تو کھڑے کھڑے ہنسنے لگے۔ آج بڑا مزہ آیا۔ کملو نے ایک لڑکے کی گھڑی اڑادی اس نے ماسٹر صاحب سے شکایت کی۔ اُس کے قریب ہی یہی حضرت بیٹھے ہوئے تھے۔

ماسٹر نے تلاشی لی تو آپ کے المار بند میں گھڑی ملی۔ پھر کیا تھا بڑے ماسٹر کے یہاں نالش
ہوئی۔ وہ سنتے ہی جھلا گئے اور کوئی تین درجن قمچیاں رسید کیں۔ سڑ اسٹر۔ سڑ اسٹر!
تمام اسکول تماشا دیکھتا تھا۔ جب تک قمچیاں پڑا کیں حضرت داد فریاد مچایا کئے۔ مگر
باہر نکلتے ہی کھل کھلانے لگے۔ اور مونچھوں پہ تاؤ دیا۔ بچی نہیں سنا آج لڑکوں نے عین
مدرسے کے دروازے پر کملا چرن کو پیٹا۔ مارتے مارتے بیدم کر دیا۔ علی ہذا۔ آئے دن
اسی قسم کی وارداتیں بیان کرنے کو ملجاتیں۔ سوشیلا سنتی اور سن سن کر کڑھتی۔ ہاں
پرتاپ اس قسم کی کوئی بات برجن کے سامنے نہ کرتا۔ اگر وہ گھر میں بیٹھی بھی ہوتی۔ تو
جب تک چلی نہ جائے یہ تذکرہ نہ چھیڑتا۔ اسے منظور نہ تھا۔ کہ میری کسی بات سے
اُسے صدمہ پہنچے۔

پرتاپ کی کہ روائیتوں کی تائید اتفاقیہ طور پر منشی سنجیون لال نے بھی بارہا کی۔
کبھی کملا بازار میں بلبل لڑاتے ملجاتا۔ کبھی شہدوں کے ساتھ سگرٹ پیتے۔ پان چباتے
بدوضعی سے گھومتا ہوا نظر آجاتا۔ منشی جی جب داماد کی یہ کیفیت دیکھتے تو گھر آتے
ہی بیوی پر غصہ اُتارتے۔ یہ سب تمہاری ہی کرتوت ہے۔ تمہیں رکھی ہوئی تھیں کہ گھر
بر دونوں اچھے ہیں۔ مانہدا اس وقت یہ خیال نہ رہتا کہ جتنا الزام سوشیلا پر ہے کم از
کم اتنا ہی مجھ پر بھی ہے۔ وہ بیچاری تو چار دیواری میں بند تھی۔ اُسے کیا خبر کہ لڑکا کس
قماش کا ہے۔ تشلدرک بدیا تھوڑی ہی پڑھی تھی۔ اس کے ماں باپ کو شریف دیکھا
اُس پر عالی خاندان ذی رتبہ۔ راضی ہو گئی۔ مگر منشی جی نے تو محض کاہلی اور سہل انگاری
کی وجہ سے چھان بین نہیں کی۔ حالانکہ اُنہیں اس کے بہت سے موقع حاصل تھے
اور منشی جی کے بیشمار بھائی اب بھی ہندوستان میں موجود ہیں جو اپنی پیاری لڑکیوں

کو اسی طرح آنکھ بند کر کے کنوئیں میں ڈھکیل دیا کرتے ہیں۔

سوسیلا کو دُنیا میں برجن سے زیادہ عزیز کوئی چیز نہ تھی۔ برجن اُسکی جان تھی۔ اُس کا دیر تھی اُس کا ایمان تھی۔ اُس میں اُس کی جان بستی تھی۔ وہ اسکی آنکھوں کا نور اور اس کے دل کا سرور تھی۔ اُس کا سب سے بڑا دُنیاوی ارمان یہ تھا کہ میری پیاری برجن اچھے گھر جائے۔ اس کے ساس سسر دیوی دیوتا ہوں۔ اُس کا شوہر شرافت کا پتلا اور سری رامچندر جی کی طرح سوشیل ہو۔ اس پر کسی آزار کی پرچھائیں بھی نہ آنے پائے۔ اُس نے مر مر کر بڑی منتوں سے یہ لڑکی پائی تھی اور اُس کی آرزو تھی کہ اس رسیلی آنکھوں والی اپنی بھولی بھالی لڑکی کو مرتے دم تک آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دونگی۔ اپنے داماد کو بلاؤ نگی۔ اپنے گھر رکھوں گی۔ برجن کے بچے ہونگے اُنکی پرورش کرونگی۔ داماد مجھے اماں کہیگا۔ میں اُسے لڑکا سمجھونگی جس دلمیں یہ ارمان ہوں اُس پر ایسی ایسی دل آزار اور دلخراش باتوں کا جو کچھ اثر ہوگا ظاہر ہے۔

افسوس! غریب سوسیلا کے سارے ارمان خاک میں مل گئے۔ اسکی ساری ہر دل آرزو پر اوس پڑ گئی۔ کیا سوچتی تھی اور کیا ہو گیا۔ اپنے دل کو بار بار سمجھاتی۔ کہ ابھی کیا ہے۔ سمجھ آجائیگی تو یہ سب باتیں آپ ہی چھوڑ دیگا۔ مگر ایک شکایت کا زخم بھرنے نہ پاتا کہ پھر کوئی تازہ واردات سُننے میں آجاتی۔ اسی طرح زخم پر زخم پڑتے گئے۔ ہائے نہیں معلوم برجن کے بھاگ میں کیا بدا ہے۔ کیا یہ حسن و شعور کی پتلی۔ میرے گھر کا اُجالا۔ میرے جسم کی جان اسی بدقماش آوارہ شخص کے ساتھ زندگی کاٹیگی۔ کیا میری شیاما اسی گدھے کے پالے پڑیگی! یہ سوچکر سوسیلا رونے لگتی۔ اور گھنٹوں روتی۔ پہلے برجن کو کبھی کبھی ڈانٹ ڈپٹ بھی دیا کرتی تھی۔ اب بھولکر کوئی بات نہ کہتی۔ اُسکی صورت دیکھتے ہی اُسے رحم آجاتا

ایک لمحہ کے لئے بھی نظروں سے دُور نہ ہونے دیتی۔ اگر ذرا دیر کے لئے وہ سُباما کے گھر چلی جاتی۔ تو اُس کے پیچھے لگی خود بھی جا پہنچتی۔ ایسا معلوم ہوتا گویا کوئی اُسے چھینے لئے جاتا ہے جس طرح اپنے بچے کو قصائی کے بغدے کے نیچے دیکھ کر گائے کا رویاں رویاں کانپنے لگتا ہے۔ اُسی طرح برجن کی مصیبت کا خیال کر کے سوسیلا کی آنکھوں میں دُنیا تاریک ہو جاتی تھی۔ ان دنوں برجن کو دم بھر کے لئے نگاہوں سے دُور کرتے اُسے وہ قلق اور گھبراہٹ ہوتی تھی جو چڑیا کو گھونسلے سے بچوں کے کھو جانے پر ہوتی ہے۔

سوسیلا ایک تو یوں ہی دائم المریض تھی۔ اُس پر آئے دن کی کوفت اور جلن نے اُسے اور بھی گھلا ڈالا۔ بیٹی کی فکر سوہان روح ہو گئی۔ شکائتوں نے کلیجہ چھلنی کر دیا۔ چھ مہینہ بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ تپ دق کے آثار نمودار ہو گئے۔ پہلے تو ہفتہ عشرہ تک طبیعت پر زور ڈالکر اپنا آزار دل چھپاتی رہی۔ مگر آخر کب تک؟ مرض بڑھنے لگا اور طاقت نے جواب دیدیا۔ قیدی بستر ہو گئی۔ حکیم اور ڈاکٹر علاج کرنے لگے۔ تین چار مہینہ میں حالت ایسی نازک ہو گئی کہ معالجوں نے بھی علاج سے ہاتھ اٹھالیا۔ برجن اور سُباما دونوں شب و روز اُسکے پاس بیٹھی رہتیں۔ برجن ایک لمحہ کے لئے بھی اُسکی نظروں سے اوجھل نہ ہونے پاتی۔ اُسے اپنے پاس نہ دیکھکر سوسیلا بدحواس سی ہو جاتی۔ اور چیخ چیخ کر رونے لگتی۔ منشی سنجیون لال پہلے تو سرگرمی سے علاج کرتے رہے۔ مگر جب دیکھا کہ کسی دوا سے فائدہ نہیں ہوتا اور مریضہ کی حالت روز بروز ابتر ہوتی جاتی ہے تو آخر اُنہوں نے بھی مایوس ہو کر ہمت چھوڑ دی۔ آج سے کئی سال پہلے جب سُباما بیمار پڑی تھی۔ اُسوقت سوسیلا نے اُس کی تیمارداری میں بڑی جانفشانی کی تھی۔ اب سُباما کی باری آئی۔ اور اُس نے ہمسائیگی اور بہناپے کا حق پُوری طرح ادا کر دیا۔

تیمارداری میں اپنے گھر کا کام کاج بھول گئی۔ دو دو تین تین دن تک پرتاپ سے بولنے کی نوبت نہ آتی۔ اکثر وہ بے کھانا کھائے ہی مدرسے چلا جاتا تھا۔ مگر کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتا۔ سوسیلا کی حالت نے اب اُسکی آتشِ حسد کو بہت مدھم کر دیا تھا۔ حسد کی آگ محسود کی ترقی اور بہتری کے ساتھ تیز اور مشتعل ہوتی جاتی ہے اور اُسی وقت بجھتی ہے جب محسود کی زندگی کا چراغ بجھ جاتا ہے۔

جس دن برج رانی کو معلوم ہو جاتا کہ آج پرتاپ بلا کھانا کھائے مدرسے جا رہا ہے اُس دن وہ سب کام چھوڑ کر اس کے گھر دوڑی جاتی" اور کھانے کے لئے ضد کرتی۔ مگر پرتاپ اس سے بات تک نہ کرتا۔ اُسے روتے چھوڑ کر باہر چلا جاتا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ برجن کو بالکل بےخطا سمجھتا تھا۔ مگر ایک ایسے رشتے کو جو برس چھ مہینے میں منقطع ہونے والا ہو وہ پہلے ہی سے توڑ دینا چاہتا تھا۔ تنہائی میں بیٹھکر وہ آپ ہی آپ گھنٹوں پھوٹ پھوٹ روتا۔ مگر ضبط کا مادہ اس کے دل میں کچھ ایسا مضبوط تھا کہ وہ اپنے جوشِ محبت کو قابو سے باہر نہ ہونے دیتا۔

ایک روز وہ مدرسے سے آکر اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا تھا۔ کہ برجن آئی۔ اُس کے رخسار آنسوؤں سے تر تھے اور لمبی لمبی سسکیاں لے رہی تھی۔ اُس کے چہرہ پر اس وقت کچھ ایسی حسرت اور بے بسی چھائی ہوئی تھی اور نگاہیں کچھ ایسی التجا آمیز تھیں کہ پرتاپ سے ضبط نہ ہو سکا۔ آبدیدہ ہو کر بولا :- "کیوں برجن ؟ روتی کیوں رہی ہو ؟"

برجن نے کچھ جواب نہ دیا بلکہ اور بلک بلک کے رونے لگی۔ پرتاپ کا ضبط رخصت ہو گیا۔ وہ بیتاب ہو کر اُٹھا اور برجن کی آنکھوں سے آنسو پونچھنے لگا۔ برجن نے آواز سنبھالکر کہا۔ "للو! اب اماں نہ جئیں گی۔ میں کیا کروں" ؟ یہ

کہتے کہتے وہ پھر سسکیاں بھرنے لگی۔

پرتاپ یہ خبر سُنکر سناٹے میں آ گیا۔ بدحواس دوڑا ہوا برجن کے گھر گیا اور سوسیلا کی چارپائی کے پاس کھڑا ہو کر رونے لگا۔ ہمارا آخری وقت کیسا مُبارک ہوتا ہے۔ وہ ہمارے پاس ایسے ایسے بے رُخوں کو کھینچ لاتا ہے جو چند دن پہلے ہماری صُورت سے بیزار تھے۔ اور جنہیں سوائے اُس طاقت کے دُنیا کی کوئی دُوسری طاقت زیر نہ کر سکتی تھی۔ ہاں یہ وقت ایسا ہی طاقتور ہے۔ وہ بڑے بڑے سرکش دشمنوں کو ہمارا مطیع کر دیتا ہے۔ جن پر ہم کبھی فتح نہ پا سکتے تھے۔ اُن پر یہ وقت ہم کو فتحمند بنا دیتا ہے۔ جن پر ہم کسی ہتھیار سے غالب نہ آ سکتے تھے اُن پر یہ وقت باوجود قویٰ کے مضمحل ہو جانے کے ہمکو غالب کر دیتا ہے۔

آج پورے سال بھر کے بعد پرتاپ نے اس گھر میں قدم رکھا۔ سوسیلا کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر چہرہ ایسا شگفتہ تھا جیسے صبح کے وقت کا کنول۔ آج صبح ہی سے وہ رٹ لگائے ہوئے تھی کہ للّو کو دکھا دو۔ سُباما نے اسی لئے برجن کو بھیجا تھا۔

سُباما نے کہا۔ بہن آنکھیں کھولو۔ للّو کھڑا ہے۔

سوسیلا نے آنکھیں کھولدیں اور اپنے دونوں بازو فرطِ محبت سے پھیلا دئے۔ پرتاپ کے دل سے کینہ کا آخری نشان بھی محو ہو گیا۔ اگر ایسے وقت میں بھی کوئی انسان دل میں کینہ کا غبار رہنے دے تو وہ انسان کہلانے کا مستحق نہیں ہے پرتاپ سچے فرزندانہ جوش سے آگے بڑھا اور سوسیلا کے آغوشِ محبت میں جا لپٹا۔ اور دونوں آدھ گھنٹہ تک روتے رہے۔ سوسیلا اسے دونوں بازوؤں سے

ایسا دبلے ہوئے تھی گویا نہ کہیں بھاگا جا رہا ہے۔ وہ اسوقت اپنے تئیں صدہا ملامتیں کر رہا تھا۔ میں ہی اس دکھیا کا جان لیوا ہوں۔ میں نے ہی حسد کے کمینہ جذبہ سے مغلوب ہو کر اسے اس نوبت کو پہنچایا ہے۔ میں ہی اس پریم کی مورت کا قاتل ہوں۔ جوں جوں یہ خیالات اُس کے دل میں آتے اُسکی آنکھوں سے آنسو بہتے تھے آخر سسیلا بولی۔ "للو! میں تو ایک دن کی اور مہمان ہوں میرا جو کچھ کہا سُنا ہو وہ معاف کرو"۔ پرتاپ کی آواز قابو میں نہ تھی۔ کچھ جواب نہ دے سکا۔

سوسیلا پھر بولی۔ "نہ جانے کیوں تم مجھ سے ناراض ہو۔ تم ہمارے گھر نہیں آتے۔ ہم سے باتیں نہیں کرتے۔ جی تمہیں پیار کرنے کو ترس ترس کے رہ جاتا ہے مگر تم میری ذرا بھی خبر نہیں لیتے۔ بتاؤ اپنی غریب چچی سے کیوں روٹھے ہو۔ ایشور جانتا ہے میں تمہیں ہمیشہ اپنا لڑکا سمجھتی رہی ہوں۔ دیکھ کر میری چھاتی پھول اُٹھتی تھی ...."

یہ کہتے کہتے نقاہت کے باعث اُسکی آواز بہت دھیمی ہو گئی۔ جیسے اُفق کی اتھاہ وسعت میں اُڑنے والی مرغابی کی آواز ہر لمحہ مدھم ہوتی جاتی ہے۔ یہانتک کہ اُس کی آواز کا صرف خیال باقی رہجاتا ہے۔ اُسی طرح سوسیلا کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے صرف سائیں سائیں رہگئی۔

سوسیلا کی وفات

تین دن اور گذر گئے۔ سوسیلا کے جینے کی اب کوئی آس باقی نہ رہی۔ تینوں دن منشی سجیون لال اُس کے پاس بیٹھے اُس کی تشفی کرتے رہے۔ وہ ذرا دیر کے لئے بھی کسی کام سے چلے جاتے تو وہ بیقرار ہونے لگتی اور رو رو کر کہتی کہ وہ مجھے چھوڑ کر کہیں چلے گئے۔ اُنکو آنکھوں کے سامنے دیکھ کر بھی اُسے تسکین نہ ہوتی۔ رہ رہ کر ایک مجنونانہ جوش سے اُنکا ہاتھ پکڑ لیتی اور مایوسانہ لہجہ میں کہتی مجھے چھوڑ کر کہیں چلے تو نہ جاؤ گے منشی جی کو استقلال کے آدمی تھے مگر ایسی باتیں سُنکر آبدیدہ ہو جاتے۔ ذرا ذرا دیر میں سوسیلا پر ایک غشی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی پھر چونکتی تو اِدھر اُدھر وحشت آمیز نگاہیں ڈالکر پوچھنے لگتی۔ وہ کہاں گئے؟ کیا چھوڑ کر چلے گئے؟ بعض اوقات نسیان کا اتنا غلبہ ہو جاتا کہ منشی جی بار بار کہتے۔ کہیں بیٹھا ہوا ہوں۔ گھبراؤ نہیں۔ مگر اُسے یقین نہ آتا۔ اُنہیں کی طرف تکتی اور پوچھتی کہاں ہیں؟ یہاں تو نہیں ہیں۔ کہاں چلے گئے؟ ذرا دیر میں جب ہوش آجاتا۔ تو خاموش ہو جاتی اور رونے لگتی۔ تینوں دن اُس نے برجن۔ سُبا ما۔ پرتاپ۔ ان تینوں میں سے ایک کو بھی یاد نہ کیا۔ وہ سب کے سب ہر دم اُس کے پاس کھڑے رہتے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا کہ وہ بجز منشی جی کے اور کسی کو پہچانتی ہی نہیں۔ جب برجن بہت بیقرار ہو جاتی اور اُس کے گلے میں ہاتھ ڈالکر رونے لگتی تو وہ ذرا آنکھیں کھول دیتی اور پوچھتی کون ہے؟ برجن؟

ہوں۔بس اور کچھ نہ پوچھتی۔ جیسے بخیل کے دل میں مرنے کے وقت سوائے اپنے دفینہ کے اور کسی بات کا دھیان نہیں رہتا۔اُسی طرح ہندو عورت اپنے آخری لمحوں میں سوائے اپنے پتی کے اور کسی کا دھیان نہیں کر سکتی۔ کیونکہ بخیل کو اپنی دولت سے جتنی محبت ہے اُس سے بہت زیادہ بدرجہا محبت پتی برتا عورت کو اپنے شوہر سے ہوتی ہے۔

کبھی کبھی سوسیلا یکایک چونک پڑتی اور ہک ابکا کر پوچھتی۔ارے یہ کون کھڑا ہے۔یہ کون بھاگا جا رہا ہے۔انہیں کیوں لئے جاتا ہے۔نہ۔میں نہ جانے دونگی۔یہ کہکر منشی جی کے دونوں ہاتھ زور سے پکڑ لیتی۔ایک لمحہ میں جب ذرا بیخودی دُور ہوتی۔تب شرما کر کہتی میں سپنا دیکھ رہی تھی۔ جیسے کوئی تمہیں لئے جاتا تھا۔دیکھو تمہیں ہماری قسم جانا نہیں۔نہیں معلوم کہاں لیجائیگا۔ پھر تمہیں کیسے دیکھونگی۔ ایں۔منشی جی کا کلیجہ مسوسنے لگتا۔اُسکی طرف نہایت محبت آمیز شفقت اور درد سے بھری ہوئی نگاہ ڈالکر بولتے۔نہیں۔میں نہ جاؤں گا۔تمہیں چھوڑ کر کہاں جاؤنگا۔سُبامااُس کی حالت دیکھتی اور روتی۔کہ اب یہ کچھ دیر کی اور مہمان ہیں۔ ضرورت نے اُسکی شرم وحیا سب دُور کر دی تھی۔منشی جی کے سامنے گھنٹوں بے حجاب کھڑی رہتی۔

چوتھے دن سوسیلا کی حالت سنبھل گئی۔منشی جی کو یقین ہو گیا کہ بس یہ آخری نیصلہ ہے۔چراغ گل ہونے سے پہلے بھبک اُٹھتا ہے۔سویرے ہی جب ہاتھ منہہ دھو کر گھر میں آئے تو سوسیلا نے انہیں اشارے سے اپنے قریب بلایا اور بولی کہ مجھے اپنے ہاتھ سے تھوڑا سا پانی پلا دو۔آج اُس پریشان کا غلبہ بہت

کم معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے برجن۔ سُبلا۔ پرتاپ سب کو بخوبی پہچانا اور برجن کو بڑی دیر تک چھاتی سے لگائے روتی رہی جب پانی پی چکی تو سُبلا سے کہا۔ بہن ذرا مجکو اُٹھا کر بٹھا دو۔ سوامی جی کے پیر چھو لوں۔ پھر نہ جانے کب ان چرنوں کے درشن ہونگے۔ سُبلا نے روتے ہوئے اُسے ہاتھوں کے سہارے ذرا سا اُٹھا دیا۔ پرتاپ اور برجن سامنے کھڑے تھے۔ سوشیلا نے منشی جی سے کہا ذرا نزدیک آ جاؤ۔ منشی جی اسوقت فرط محبت و درد سے بیخود ہو کر اُس کے سینہ سے لپٹ گئے اور روتے ہوئے بولے تم گھبراؤ نہیں۔ ایشور چاہیگا تو تم اچھی ہو جاؤ گی۔ سوشیلا نے مایوسانہ انداز سے مسکرا کر کہا ہاں آج اچھی ہو جاؤنگی۔ ذرا اپنا پیر بڑھا دو۔ میں چوم لوں۔ منشی جی ہچکچاتے رہے۔ اُسوقت سُبلا پہلی بار روتے ہوئے بولی۔ پیر بڑھا دیجئے۔ اِن کے دل کی آرزو بھی نکل جائے۔ تب منشی جی نے پیر بڑھا دیا۔ سوشیلا نے اُسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کئی بار چوما اور تب اُن پر ہاتھ رکھکر رونے لگی اور دم کی دم میں دونوں پیر گرم قطروں سے تر ہوگئے۔ پتی برتا عورت نے پریم کے موتی شوہر کے قدموں پر نثار کر دئے۔

جب ذرا آواز قابو میں ہوئی۔ تو اس نے برجن کا ایک ہاتھ پکڑ کر منشی جی کے ہاتھ میں دیا اور نہایت دھیمی آواز میں بولی:۔ "سوامی جی۔ آپکے ساتھ بہت دن رہی اور زندگی کا بہت سکھ اُٹھایا۔ اب پریم کا ناطہ ٹوٹتا ہے۔ اب میں دم بھر کی مہمان ہوں۔ پیاری برجن کو تمھیں سونپے جاتی ہوں۔ میری یہی نشانی ہے۔ اس پر ہمیشہ مہربانی کی نگاہ رکھنا۔ میری قسمت میں اپنی پیاری بچی کا سُکھ دیکھنا نہ لکھا تھا۔ اسے میں نے کبھی کوئی کڑی بات نہیں کہی۔ کبھی کڑی نگاہوں سے نہیں دیکھا۔ یہ میری زندگی کا پھل ہے ایشور کے لئے تم اس کی طرف سے بے شفقت نہ ہونا۔"۔۔۔۔ یہ کہتے کہتے ہچکیاں

بندھ گئیں اور غشی سی آگئی

جب ذرا پھر افاقہ ہوا تو اُس نے سُبا ملک کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑے اور روکر بولی :- بہن! برجن تمہارے سپرد ہے۔ تم اُس کی ماں کی جگہ ہو۔ للو! پیارے ایشور کرے تم تم جُگ جُگ جیئو۔ اپنی برجن کو بھولنا مت۔ وہ تمہاری غریب بے ماں کی بہن ہے تم میں اُسکی جان بستی ہے۔ اسے رُلانا مت۔ کڑھانا مت۔ اسے کبھی کڑی بات مت کہنا۔ اس سے کبھی نہ روٹھنا۔ اُسکی طرف سے بیخبر نہ ہونا نہیں تو وہ رو رو کر جان دیدیگی۔ اُس کے بھاگ میں نہ جانے کیا بدا ہے مگر تم اسے اپنی سگی بہن سمجھ کر سدا اُس کی دلجوئی کرتے رہنا۔ میں ذرا دیر میں تم لوگوں کو چھوڑ کر چلی جاؤنگی۔ مگر تمہیں میری قسم اُسکی طرف سے من موٹا نہ کرنا۔ تم نے اور تمہاری ماں نے اُسے آدمی بنایا ہے اور تمہیں اُس کا بیڑہ پار لگاؤ گے۔ میرے دل میں بڑے بڑے ارمان تھے۔ میری لالسا تھی کہ تمہارا بیاہ کرونگی۔ تمہارے بچے کھلاؤں گی۔ مگر بھاگ میں کچھ اور ہی بدا تھا۔

یہ کہتے کہتے پھر بیہوشی اور نقاہت نے اس پر غلبہ کیا۔ سارا گھر رو رہا تھا۔ مہریاں۔ مہراجنیں۔ نوکر چاکر سب اس کا جس گا رہے تھے۔ عورت نہیں دیوی تھی۔ ردھیا۔ اتنے دن ٹہل کرتے ہوئے مگر کبھی کڑی بات نہیں کہی۔ مہراجن۔ ہم کو بیٹی کی طرح مانتی تھیں۔ کھانا کیسا ہی پکا کے رکھدوں مگر کبھی ناراض نہیں ہوئیں۔ جب بات کرتیں مُسکرا کے۔ مہراج جب آتے تو انہیں جرور سیدھا اور دلواتی تھیں۔

اسی طرح کی باتیں سب کر رہے تھے۔ دوپہر کا وقت آیا۔ مہراجن نے کھانا

بنایا۔ مگر کھاتا کون۔ منشی جی بڑے اصرار سے گئے اور منہ جوٹھا کر کے چلے آئے۔ پرتاپ نے وہاں سے ٹلنے کی قسم کھالی تھی۔ برجن اور سُباما کو بھوک کہاں۔ سوسیلا کبھی برجن کو پیار کرتی۔ کبھی سُباما کو گلے لگاتی۔ کبھی پرتاپ کو چومتی اور کبھی اپنی بپتی کہہ کے روتی۔ سہ پہر کے وقت اُس نے سب نوکروں کو بلوایا اور اُن سے خطا معاف کروائی۔ جب یہ سب چلے گئے تو سوسیلا سُباما سے بولی۔ "بہن پیاس بہت لگتی ہے اُن سے کہہ دو ذرا اپنے ہاتھ سے پھر پانی پلادیں"۔ منشی جی پانی لائے اور سوسیلا نے ایک گھونٹ بمشکل تمام حلق کے نیچے اتارا۔ اور ایسا معلوم ہوا گویا اسے کسی نے امرت پلادیا۔ اُس کا چہرہ روشن ہو گیا آنکھوں میں نم بھر آیا شوہر کے گلے میں ہاتھ ڈالکر بولی "میں کیسی بھاگوان ہوں کہ تمہاری گود میں مرتی ہوں"۔ یہ کہہ کر وہ چپ ہوگئی جیسے کوئی بات کہنا چاہتی ہے اور لحاظ سے نہیں کہتی۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے پھر منشی جی کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی: "اگر تم سے کچھ مانگوں تو دو گے"

منشی جی نے متعجب ہو کر کہا۔ "تمہارے لئے مانگنے کی ضرورت ہے؟ شوق سے کہو"

سوسیلا:۔ تم میری بات کبھی نہیں ٹالتے تھے۔

منشی جی۔ مرتے دم تک کبھی نہ ٹالونگا۔

سوسیلا۔ ڈر لگتا ہے۔ کہیں نہ مانو تو۔۔۔

منشی جی۔ تمہاری بات اور میں نہ مانوں۔

سوسیلا۔ میں تمکو نہ چھوڑونگی۔ ایک بات بتلادو بھلی مرجائیگی تو اسے بھول جاؤگے؟

منشی جی۔ ایسی باتیں نہ کرو۔ دیکھو برجن روتی ہے۔

سوسیلا۔ بتلادو۔ مجھے بھولوگے تو نہیں؟

منشی جی۔ تمہاری یاد مرتے دم تک تازہ رہیگی۔

سوسیلا نے اپنے مُرجھائے رخسارے منشی جی کے ہونٹوں پر رکھدئے اور دونوں باہیں اُنکے گلے میں ڈالدیں۔ پھر برجن کو قریب بُلا کر آہستہ آہستہ سمجھانے لگی۔ دیکھو بیٹی۔ لالہ جی کا کہنا ہردم ماننا۔ ان کی سیوا خوب من لگا کر کرنا۔ گھر کا سارا بوجھ اب تمہارے ہی اُوپر ہے۔ اب تمہارے سوا کون سنبھالیگا۔

یہ کہہ کر اُس نے شوہر کی طرف دردآمیز نگاہوں سے دیکھکر کہا۔ "میں اپنے من کی بات نہیں کہنے پائی۔ جی ڈوبا جا رہا ہے"۔

منشی جی۔ تم ناحق پس و پیش کرتی ہو۔

سوسیلا۔ تم میرے ہو کہ نہیں؟

منشی جی۔ تمہارا اور مرتے دم تک تمہارا۔

سوسیلا۔ ایسا نہ ہو کہ میرے پیچھے ہو اور جو چیز میری تھی وہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں چلی جائے۔

منشی جی (اشارہ سمجھکر) اس کا اندیشہ نہ کرو۔ جب تک جیونگا تمہارا ہی ہونگا۔

سوسیلا نے برجن کو بھی بابا کے قدموں پر گرا دیا اور مارے ضعف کے بیدم ہوگئی۔ برجن اور پیتا چپ چاپ رونے لگے۔ سب لوگ سمجھ گئے کہ ٹمٹماتا ہوا چراغ بجھ گیا۔ منشی جی نے کان لگاتے ہوئے سوسیلا کے سینہ پر ہاتھ رکھا۔ سانس دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ مہراجن کو بلا کر کہا اب انہیں زمین پر لٹا دو۔ یہ کہتے ہوئے بے اختیار رونے لگے۔ مہراجن اور سُبا ماں نے مل کر سوسیلا کو زمین پر لٹا دیا۔ تب برجن نے مٹھیاں تک سُکھا ڈالی تھیں۔

اندھیرا ہو چلا تھا۔ سارے کمرہ میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ حسرتناک سناٹا۔

وحشت ناک سناٹا۔ وہ سناٹا جو دلوں کو ملول اور متفکر بنا دیتا ہے۔ رونے والے روتے تھے۔ مگر گلا دبا دبا کر۔ باتیں ہوتی تھیں مگر دبی آوازوں میں۔ سوسیلا زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ وہ تن نازک جو کبھی ماں کی گود میں پلا۔ کبھی محبت کے آغوش میں لپٹا کبھی پھولوں کے سیج پر سویا۔ اسوقت زمین پر پڑا ہوا تھا۔ ابھی تک نبض آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ منشی جی فرط الم و یاس سے خاموش اسکے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے۔ دفعتہً سوسیلا کے اعضا میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے سر اٹھا دیا اور دونوں ہاتھوں سے منشی جی کا پیر پکڑ لیا۔ اور روح پرواز کر گئی۔ دونوں ہاتھ ان کے پیروں کا حلقہ کئے ہی رہ گئے۔ یہ زندگی کا آخری کام تھا۔

رونے والو! روؤ۔ کیونکہ سوائے رونے کے اور تم کر ہی کیا سکتے ہو۔ تمہیں اسوقت کوئی کتنا ہی سمجھائے۔ مگر تمہاری آنکھیں آنسوؤں کی باڑھ کو نہ روک سکینگی۔ رونا تمہارا فرض ہے۔ زندگی میں رونے کے موقعے شاذ ہی ملتے ہیں۔ کیا اس موقع پر بھی تمہاری آنکھیں بخل کر جائیں گی۔ آنسوؤں کے تار بندھے ہوئے تھے۔ سسکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کہ مہراجن چراغ جلا کر کمرہ میں لائی۔ ذرا دیر پہلے سوسیلا کی زندگی کا چراغ بجھ چکا تھا

برجن کی رُخصتی

رادھا چرن رڑکی کالج سے نکلتے ہی مُراد آباد کے انجینیر مقرر ہو گئے۔ اور چندرا اُن کے ساتھ مُراد آباد کو چلی۔ پریموتی نے بہت روکنا چاہا۔ مگر جانے والے کو کون روک سکتا ہے۔ سیبوتی کب کی سسرال جا چکی تھی۔ یہاں گھر میں اکیلی پریموتی رہ گئی۔ اُسی کے سر گھر کا کام کاج۔ آخر یہ رائے ہوئی کہ برجن کی رُخصتی کا پیغام دیا جائے۔ ڈپٹی صاحب رُخصتی کے سخت خلاف تھے۔ مگر گھر کے معاملات میں پریموتی کا حکم قطعی ہوتا تھا۔

سنجیون لال نے پیغام منظور کر لیا۔ کچھ دنوں سے وہ تیرتھ جاترا کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ سوشیلا کے مرنے کے بعد رفتہ رفتہ اُنھوں نے تمام دنیاوی تعلقات ترک کر دیے تھے۔ دن بھر کمرہ میں آسن مارے بھگوت گیتا اور یوگ بششٹ اور دوسری معرفت کی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے۔ شام ہوتے ہی گنگا اشنان کو چلے جاتے۔ وہاں سے رات گئے لوٹتے اور دو چار لقمے کھا کر سو جاتے۔ اکثر پرتاپ چند بھی اُن کے ساتھ گنگا اشنان کو جاتا اور اگرچہ ابھی سولہ سال کا بھی نہ ہوا تھا مگر مناسبت فطری کہو یا ورثہ پدری یا فیض صحبت کہ ابھی سے اُسے اسرار معرفت پر غور و خوض کرنے میں بے حد لطف حاصل ہوتا۔ گیان اور حقیقت کے تذکرے سُنتے سُنتے اس کا رجحان بھی بھگتی کی جانب ہو چلا تھا۔ اور بعض اوقات منشی جی سے ایسے دقیق

مسائل پر بحث کرتا کہ وہ حیرت میں آجاتے ۔
برج رانی پر سُباما کی تعلیم کا اُس سے بھی گہرا اثر پڑا تھا جتنا پرتاپ چند
پر منشی جی کی صحبت اور تعلیم کا ۔ اُس کا پندرھواں سال تھا ۔ جو ہمارے یہاں شباب
کی پہلی منزل سمجھی جاتی ہے ۔ اس سن میں لڑکیوں پر شوقِ سنگار کا جنون سوار
ہوتا ہے ۔ ان کے انداز اور طریق میں بجائے طفلانہ شوخی کے ایک متانت آمیز
چلبلاپن پیدا ہو جاتا ہے ۔ دلوں میں شباب کی اُمنگیں لہرے مارنے لگتی ہیں اور
نگاہوں سے بجائے سادگی اور شوخی کے ایک جذبہ آمیز رسیلا پن برسنے لگتا ہے ۔ مگر
برج رانی ابھی تک وہی بھولی بھالی لڑکی تھی ۔ اس کا چہرہ معصومیت کی تصویر
تھا ۔ ایک ایک انداز سے سادگی ٹپکتی تھی ۔ ہاں رفتار میں ایک دلآویز دھیراپن اور
طرز کلام میں لبھانے والی شیرینی پیدا ہو گئی تھی ۔ اُسکی باتیں سُننے والے پر موہنی منتر پڑھ
دیتی تھیں ۔ منہ اندھیرے اُٹھتی اور سب سے پہلے منشی جی کا کمرہ صاف کر کے اُن کے پوجا
پاٹ کا سامان قرینہ سے رکھ دیتی ۔ پھر رسوئی کے دھندے میں لگ جاتی ۔ دوپہر کا
وقت اس کے لکھنے پڑھنے کا تھا ۔ سُباما سے اُسے جتنی محبت اور عقیدت تھی اتنی
شاید اپنی ماں سے بھی نہ رہی ہو ۔ اُسکی مرضی برجن کے لئے قانون تھی ۔
سُباما کی تو صلاح تھی کہ ابھی رخصتی نہ کی جائے مگر منشی جی مُصر ہوئے اور بدائی کی
تیاریاں ہونے لگیں ۔ جوں جوں وہ مصیبت کی گھڑی سر پر آتی جاتی برجن کی بیقراری
بڑھتی جاتی ۔ رات دن رویا کرتی ۔ کبھی باپ کے پیروں پڑتی ۔ کبھی سُباما کے پیروں سے
لپٹ جاتی مگر بیاہی لڑکی پرائے گھر کی ہو جاتی ہے ۔ اس پر کسی کا کیا اختیار
پرتاپ چند اور برجن کتنے ہی دنوں تک بھائی بہنوں کی طرح ایک ساتھ رہے تھے

مگر اب برجن کی آنکھیں اُسے دیکھتے ہی نیچے کو جھک جاتیں۔ پرتاپ کی بھی یہی کیفیت تھی۔ گھر میں بہت کم آتا۔ کسی ضرورت سے آتا تو کچھ اس طرح نگاہیں نیچی کئے اور سمٹا ہوا گویا مجرم ہے۔ اسکی ان نگاہوں میں وہ راز محبت چھپا ہوا تھا جسے وہ کسی متنفس حتیٰ کہ برجن پر بھی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ایک روز شام کا وقت تھا۔ رخصتی کو صرف تین دن رہ گئے تھے۔ پرتاپ کسی ضرورت سے اندر گیا اور اپنے کمرہ میں لیمپ جلانے لگا کہ برجن آئی۔ اُس کا آنچل آنسوؤں سے تر تھا۔ اُس نے آج دو برس کے بعد پرتاپ کی طرف پُر آب آنکھوں سے دیکھ کر کہا "للو مجھ سے کیسے صبر ہوگا!"

پرتاپ نے مردانہ ضبط سے کام لیا۔ اُسکی آنکھوں میں آنسو نہ آئے۔ اُسکی آواز بھاری ہوئی۔ واعظانہ لہجہ میں بولا۔ "ایشور تمہیں صبر کی طاقت دیگا"۔

برجن کی گردن جھک گئی۔ آنکھیں زمین میں گڑ گئیں اور ایک دبی ہوئی سسکی نے حسرت و درد کا وہ دفتر بیان کر دیا۔ جو زبان سے ناممکن تھا۔

رخصتی کا دن لڑکیوں کے لئے عجیب حسرت کا دن ہوتا ہے۔ بچپن کی سکھیاں۔ سہیلیاں۔ ماں باپ۔ بھائی بند۔ گھر کے آدمی غرضیکہ ان سب سے ناطہ ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ خیال کہ میں پھر اس گھر میں آؤنگی اُسے مطلق تسکین نہیں دیتا۔ کیونکہ اب آئیگی تو مہمان کی حیثیت سے آئیگی۔ اُن لوگوں سے جدا ہونا جن کے درمیان زندگی کے گہوارے میں کھیلنا اور بے فکریوں کے چمن میں سیر کرنا نصیب ہوا ہو اُس کے جگر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ ابتک وہ دُنیا کے فرائض اور پابندیوں سے آزاد رہتی تھی۔ مگر آج سے اس کے سر پر ایسا بوجھ لدتا ہے جو مرتے دم تک اُٹھانا پڑیگا۔

برجن کا سنگار کیا جا رہا تھا۔ نائن اُس کے پیروں میں مہاور لگا رہی تھی
کوئی اُس کے سر کے بالوں کو گوندھ رہی تھی۔ کوئی جوڑے میں عطر لگا رہی تھی مگر جس
کے لئے یہ سب تیاریاں ہو رہی تھیں وہ زمین پر موتی کے دانے یوں بکھیر رہی تھی
گویا انکا کچھ مول ہی نہیں ہے اتنے میں باہر سے پیغام آیا۔ ساعت ٹلی جا رہی ہے
جلدی کرو۔ سُشیلا پاس کھڑی تھی۔ برجن اس کے گلے لپٹ گئی۔ اور وہ جوش گریہ جو
ابتک دبی ہوئی آگ کی طرح سُلگ رہا تھا یکبارگی یوں اُبل پڑا جیسے کوئی آگ میں
تیل ڈال دے۔

ذرا دیر میں پالکی دروازہ پر آئی۔ برجن پاس پڑوس کی عورتوں سے گلے ملی۔
سُشیلا کے پیر چھوئے اور تب دو تین عورتوں نے اُسے پالکی کے اندر بٹھا دیا۔ اُدھر
پالکی اُٹھی اِدھر سُشیلا غش کھا کر زمین پر گر پڑی۔ گویا اُس کے جیتے جی کوئی اُسکی
جان نکال کر لئے جاتا تھا۔ گھر سُونا ہو گیا۔ سینکڑوں عورتوں کا جمگھٹ تھا۔
مگر ایک برجن کے نہ ہونے سے مکان پھاڑے کھاتا تھا۔

کملا چرن کے دوست

جیسے سیندور کی سرخی سے مانگ سج جاتی ہے اُسی طرح برج رانی کے آنے سے پریموتی کے گھر کی رونق دوبالا ہوگئی۔ ماں نے اُسے ایسے گُن سکھائے تھے کہ جس نے اُسے دیکھا موہ گیا۔ یہانتک کہ سیوتی کی سہیلی راتی کو بھی پریموتی کے سامنے اقرار کرنا پڑا کہ تمہاری چھوٹی بہو نے تو ہم سب کا رنگ پھیکا کردیا۔ سیوتی اُس سے دن دن بھر باتیں کرتی۔ اور اُس کا جی نہ بھرتا۔ اُسے اپنے گانے پہ ناز تھا۔ مگر اس میدان میں بھی برجن بازی لے گئی۔

اب کملا چرن کے دوستوں نے تقاضا کرنا شروع کیا کہ بھئی نئی دُلہن گھر میں لائے ہو کچھ دعوت جلسہ کی بھی فکر ہے۔ سُنتے ہیں نہایت حسین بیوی پائی ہے۔ کملا چرن کو روپیہ تو سسرال میں ملا ہی تھا۔ جیب کھنکھنا کر بولے۔ "اجی دعوت لو۔ شراب پیو۔ اڑاؤ آنکھیں سینکو۔ ہاں بہت ہوحق نہ مچانا ورنہ کہیں اندر خبر ہو تو سمجھیں یہ شہدا ہے۔ جب سے وہ گھر میں آئی ہیں اینجانب کا قافیہ تنگ ہے۔ سُنتا ہوں مکمل انگریزی۔ فارسی۔ سنسکرت الم غلم سب گھول کے بیٹھی ہے۔ ڈرتا ہوں کہیں انگریزی میں پوچھ بیٹھی یا فارسی میں بات چیت شروع کردی تو سوائے بغلیں جھانکنے کے اور کیا کرونگا۔ اسلئے ابھی کنی کاٹتا پھرتا ہوں۔"

یوں تو کملا چرن کے دوستوں کی تعداد لا محدود تھی۔ شہر کے جتنے کبوترباز۔

لنگوٹے باز شہدے تھے۔ سب اُن کے دوست۔ مگر بڑی دوستوں میں فقط پانچ آدمی تھے اور سب کے سب فاقہ مست۔ آوارہ ان میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ میاں مجید تھے۔ کچہری میں عرائض نویسی کیا کرتے تھے۔ جو کچھ ملتا وہ سب شراب کی نذر کرتے۔ دوسرا الحمر حمید خاں کا تھا۔ ان ذات شریف کے ورثہ میں بڑی دولت ملی تھی مگر تین سالوں میں سب کچھ ارباب نشاط کی نذر کر دیا۔ اب یہ وطیرہ تھا کہ شام کو سج دھج بنا کر گلیوں کی خاک چھانتے پھرتے اور وقت ضرورت پر بازار حسن کی دلالی بھی کیا کرتے تھے۔ اس بازار کے خریداروں اور بیوپاریوں میں اُن کی بڑی رسائی تھی۔ تیسرے حضرت سعید حسین تھے۔ ایک ہی شاطر تماش باز۔ سینکڑوں کے داؤ لگا لینے والے۔ بیوی کے زیوروں پر ہاتھ صاف کرنا روزمرہ کا مشغلہ تھا۔ باقی دو صاحب رام سیوک اور چندو لال کچہری میں ملازم تھے۔ تنخواہیں تھوڑی مگر بالائی رقم وافر۔ نصف شراب کو نذر کرتے اور نصف شاہدان حسن فروش کی خاطر و مدارات میں صرف ہوتی۔ گھر کے لوگ فاقے کرتے یا بھیک مانگتے۔ انہیں صرف اپنے عیش سے کام تھا۔

مشورہ تو ہو ہی چکا تھا۔ آٹھ بجے جب ڈپٹی صاحب لیٹے تو یہ پانچوں حضرت جمع ہوئے اور دور چلنے لگا۔ پانچوں پینے میں حاتم تھے۔ دائم الخمر۔ جب ذرا سرور گھٹا تو بہکی بہکی باتیں ہونے لگیں۔

مجید۔ کیوں بھئی کملا چرن! سچ کہنا دیکھ کر جی خوش ہو گیا یا نہیں؟

کملا۔ اب آپ بہکنے لگے کیوں؟

رام سیوک۔ بتلا کیوں نہیں دیتے۔ اس میں جھینپنے کی کیا بات ہے؟

کملا - بتلا کیا اپنا سر دوں - کبھی سامنے جانے کا اتفاق بھی تو ہوا ہو - کل کواڑ کی دراڑ سے ایک نظر دیکھ لیا تھا - ابھی تک تصویر نگاہوں میں پھر رہی ہے -

چندو لال - میرے یار تو بڑا بلند اقبال ہے -

کملا - ایسا بیقرار ہوا کہ گرتے گرتے بچا - بس پری سمجھ لو -

مجید - تو بھئی یہ دوستی کس دن کام آئیگی - ایک نظر ہمیں بھی دکھاؤ -

سعید - بیشک دوستی کے یہی معنی ہیں کہ آپس میں کوئی پردہ نہ رہے - دوستی کا مسئلہ ہی القط ہو جائے

چندو لال - دوستی میں کیا پردہ - انگریزوں کو دیکھو - بیوی ڈولی سے اُتری نہیں - کہ یار دوست ہاتھ ملانے لگے -

رام سیوک - مجھے تو بن دیکھے چین نہ آئیگا - ہیں تو کُچھ ؟

کملا - ایک دھول لگا کر زبان کاٹ لی جائیگی سمجھے -

رام سیوک - کچھ پروا نہیں - آنکھیں تو دیکھنے کو رہینگی -

مجید - بھئی کملا چرن بُرا ماننے کی کوئی بات نہیں - اب سو وقت تمہارا فرض ہے کہ دوستوں کی فرمائش پوری کرو -

کملا - ارے تو میں انکار کب کرتا ہوں -

چندو لال - واہ میرے شیر - یہ مردوں کی سی باتیں ہیں - تو ہم لوگ بن ٹھن کر آجائیں - کیوں ؟

کملا - جی ذرا منہ میں کالکھ لگا لیجئیگا - بس اتنا کافی ہے -

سعید - تو کار خیر میں تاخیر کیوں ہو - آج ہی کی ٹھہری نا ؟

کملا۔ آج ہی سہی مگر یاد رہے کل آپ سب صاحب کی بیویوں کے درشن کرونگا! اُس وقت اگر کسی نے چیں چپڑ کیا تو بندہ کا پاپوش مبارک ہوگا اور اُس کا فرق ناہموار کے۔

سب کے سب :۔ منظور بدل و جاں منظور۔

رام سیوک۔ یہاں کیا دھرا ہے۔ پانچ بچوں کی ماں۔ اس پر پھٹے حال خاصی چڑیل ہو رہی ہے۔

چندو لال۔ یہاں اس سے بھی بدتر حال ہے۔ تین مہینہ سے چھتیا آ رہا ہے مگر کس مردود نے ایک کوڑی کی بھی دوا لی ہو۔ مورت دیکھتے ہی بخار چڑھ آتا ہے۔

سعید۔ ایجاب یہ روگ ہی نہیں پالتے ہیں چند روزہ انتظام مستقل انتظام سے بہتر ہوتا ہے۔

ادھر تو مٹے ناب کے دور چل رہے تھے۔ اُدھر برجن پلنگ پر لیٹی ہوئی خیالوں میں غرق تھی۔ بچپن کے دن کیسے اچھے ہوتے ہیں۔ کاش وہ دن پھر آ جاتے۔ آہ! کیسی دلچسپ زندگی تھی دُنیا نافہ پیار اور محبت کا گہوارہ تھی۔ کیا وہ کوئی دوسری دُنیا تھی کیا اُن دنوں دُنیا کی چیزیں بہت خوبصورت ہوتی تھیں۔ انہیں خیالوں میں آنکھ ذرا جھپک گئی اور بچپن کا ایک واقعہ پیش نظر ہو گیا۔ للو نے اُسکی گڑیا مروڑ دی۔ اُس نے اُس کی کتاب کے دو ورق پھاڑ ڈالے۔ تب للو نے اُسکی پیٹھ میں زور سے چٹکی لی اور باہر بھاگا۔ وہ رونے لگی۔ اور للو کو کوس رہی تھی کہ سُلما اُسکا ہاتھ پکڑے ہوئے آئی اور بولی۔ "کیوں بیٹی اُس نے تمہیں مارا ہے نا؟ یہ بہت مار مار کر بھاگتے ہیں۔ آج انکی مرمت کرتی ہوں۔ دیکھوں کہاں مارا ہے" للو نے ڈبڈبائی

آنکھوں سے برجن کی طرف دیکھا اور برجن نے مسکرا کر کہا "مجھے انہوں نے کہاں مارا۔ یہ مجھے کبھی نہیں مارتے " یہ کہہ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اپنے حصہ کی مٹھائی کھلائی۔ اور پھر دونوں ملکر کھیلنے لگے۔ وہ زمانہ اب کہاں؟ اس زمانہ کی یاد ایک خواب حسرت کی یاد ہے۔

رات زیادہ گزر گئی تھی۔ یکایک برجن کو ایسا معلوم ہوا کہ سامنے والی دیوار کوئی دھمد دھما رہا ہے۔ اس نے کان لگا کر سنا۔ برابر آوازیں آ رہی تھیں کبھی رک جاتیں۔ پھر آنے لگتیں۔ ذرا دیر میں مٹی گرنے لگی۔ خوف کے مارے برجن کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ جی کڑا کر کے اٹھی اور مہراجن کو جھنجھوڑنے لگی۔ گھگھی بندھی ہوئی تھی۔ اتنے میں مٹی کا ایک بڑا سا ڈھیلا سامنے گرا اور مہراجن چونک کر اٹھ بیٹھی۔ دونوں کو یقین ہو گیا کہ چور آئے ہیں۔ مہراجن ایک ہی چالاک عورت تھی سمجھی کہ چلاؤنگی تو جاگ ہو جائیگی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ چور پہلے سینہ میں پیر ڈالکر دیکھتے ہیں تب خود گھستے ہیں۔ اس نے ایک ڈنڈا اٹھا لیا کہ جب پیر ڈالیگا تو ایسا تاک کر مارونگی کہ ٹانگ ٹوٹ جائیگی۔ مگر چور نے پیر کے بجائے سینہ میں سے سر باہر نکالا۔ مہراجن تاک میں تو تھی ہی ڈنڈا چلا دیا اور کھٹ کی آواز آئی۔ چور نے فوراً سر کھینچ لیا۔ اور یہ کہتا ہوا سنائی دیا "اف! مار ڈالا بھیجا بھنا گئی۔" پھر کئی آدمیوں کے ہنسنے کی آواز آئی اور اس کے بعد سناٹا ہو گیا۔ اتنے میں اور لوگ جاگ پڑے اور باقی رات گپ شپ میں کٹی۔

سویرے جب کملا چرن گھر میں آئے تو آنکھیں سرخ تھیں اور سر میں آماس تھا۔ مہراجن نے نزدیک جا کر دیکھا اور آ کر برجن سے بولی :- بہو ایک

بات کہوں۔ بُرا تو نہ مانوگی۔

برجن۔ برا کیوں مانونگی۔ کہو۔ کیا کہتی ہو؟

مہراجن۔ رات جو سیندھ پڑی تھی وہ چوروں نے نہیں لگائی تھی۔

برجن۔ پھر کون تھا؟

مہراجن۔ گھر ہی کے بھیدی تھے۔ باہری کوئی نہیں تھا۔

برجن۔ کیا کسی کہار کی شرارت تھی۔

مہراجن۔ نہیں۔ کہاروں میں ایسا کوئی نہیں ہے۔

برجن۔ پھر کون تھا۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتیں۔

مہراجن۔ میری جان میں تو چھوٹے بابو تھے۔ میں نے وہ لکڑی نہیں پھینکی تھی وہ اُن کے سر میں لگی۔ سر پھولا ہوا ہے۔

اتنا سنتے ہی برجن کے تیور بدل گئے اور چہرہ تمتما گیا۔ غضبناک ہو کر بولی "مہراجن! ہوش سنبھالکر باتیں کرو۔ تمہیں یہ کہتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ تمہیں میرے سے ایسی بات کہنے کا حوصلہ ہوا؟ خود میرے سر پر الزام تھوپ رہی ہو۔ تمہارے بڑھاپے پر ترس آتا ہے۔ ورنہ اسی وقت تمہیں یہاں سے کھڑے کھڑے نکلوا دیتی۔ تب تمہیں معلوم ہوتا کہ زبان کو قابو میں نہ رکھنے کا یہ پھل ہوتا ہے یہاں سے اُٹھ جاؤ۔ مجھے تمہاری صورت دیکھ کر بخار سا چڑھ رہا ہے۔ تمہیں اتنا نہ سمجھ پڑا کہ میں کیسی بات زبان سے نکال رہی ہوں۔ انہیں ایشور نے کیا نہیں دیا ہے سارا گھر اُن کا ہے۔ میرا جو کچھ ہے۔ اُنکا ہے۔ میں خود اُن کی چیری ہوں۔ اور اُن کی نسبت تم ایسی بات کہہ بیٹھیں۔

مگر جس بات پر برجن ایسی برہم ہوئی اسی بات پر گھر کے دوسرے آدمیوں کو آسانی سے یقین آ گیا۔ ڈپٹی صاحب کے کان میں بات پہنچی۔ وہ کملا چرن کو اس سے زیادہ شریر النفس سمجھتے تھے۔ جتنا وہ فی الواقع تھا۔ خوف ہوا کہ کہیں یہ حضرت بہو کے زیوروں پر ہاتھ صاف کریں۔ بہتر ہے کہ انہیں بورڈنگ ہاؤس بھیج دوں۔

کملا چرن نے یہ تجویز سُنی تو بہت چیخے چلّائے۔ مگر کچھ سوچ کر دوسرے دن بورڈنگ ہاؤس چلے گئے۔ برجن کے آنے سے پہلے کئی بار یہ تجویز ہوئی تھی مگر کملا کی ضد کے سامنے ایک بھی پیش نہ گئی۔ یہ بیوی کی نگاہوں میں ذلیل ہو جانے کا خوف تھا۔ جو اب کی بار اسے بورڈنگ ہاؤس لے گیا۔

کایا پلٹ

پہلا دن تو کملا چرن نے کسی طرح بورڈنگ ہاؤس میں کاٹا۔ صبح سے شام تک پڑے سویا کئے۔ دوسرے دن خیال آیا کہ آج تو نواب صاحب اور تیکھے مزاج کے بٹیروں میں بدا ہوا جوڑ ہے۔ کیسے کیسے نست پٹھے ہیں کہ دیکھکر روح وجد کرنے لگے۔ آج اُنکی پکڑ دیکھنے کے قابل ہوگی۔ شہر کا شہر پھٹ پڑے تو عجب نہیں۔ چہ خوش۔ شہر کے لوگ تو بہار اُڑائیں اور میں یہاں کتابوں سے سر لڑاؤں۔ یہ سوچتے سوچتے اُٹھا اور دم کی دم میں بیان کے موقع پر تھا۔

یہاں آج خلقت کی خلقت جمع تھی۔ خاصہ میلہ لگا ہوا تھا۔ سقّے چھڑکاؤ کر رہے تھے۔ سگرٹ والے۔ کباب والے۔ تمبولی سب اپنی اپنی دکانیں لگائے بیٹھے تھے اور شہر کے رنگین مزاج نوجوان ہاتھوں میں بٹیر لئے یا مخملی اڈوں پر بلبلوں کو بٹھلائے مٹر گشت کر رہے تھے۔ کملا چرن کے دوستوں کی اس جگہ کیا کمی۔ لوگ اُنھیں خالی ہاتھ دیکھتے تو حیرت سے پوچھتے۔ ارے راجہ صاحب! آج خالی ہاتھ کیسے۔ اتنے میں میاں سعید، مجید، حمید وغیرہ نشہ میں چور سگرٹ کے دُھوئیں پھکا پھک اُڑاتے نظر آئے۔ کملا چرن کو دیکھتے ہی سب کے سب سرپٹ دوڑے اور پانچوں کے پانچ عیوب شرعی کی طرح اُن سے لپٹ گئے۔

مجید۔ آج تم کہاں غائب ہو گئے تھے میاں؟ قرآن کی قسم مکان کے سیکڑوں

چکر لگائے ہوں گے

رام سیوک۔ آجکل عید کی راتیں ہیں بھئی آنکھیں نہیں دیکھتے نشہ سا چڑھا ہوا ہے۔

چندولال۔ چین کر رہا ہے بیٹھا جب سے نازنین گھر میں آئی ہے۔ اس مردِ خدا نے بازار کی صورت تک نہیں دیکھی۔ جب دیکھئے گھر میں گھسا رہتا ہے۔ خوب چین کر لے یار۔ دوستوں کی طرف سے بھی بوسے لے لیا کر۔

کملا۔ چین کیا خاک کروں۔ یہاں تو قید میں پھنس گیا تین دن سے بورڈنگ میں پڑا ہوں

مجید۔ ارے! خدا کی قسم!"

کملا۔ تیری جان کی قسم۔ پرسوں سے مٹی پلید ہو رہی ہے۔ آج سبھوں کی آنکھیں بچا کر نکل بھاگا۔

رام سیوک۔ اُف! مصیبت سی مصیبت ہے۔ مگر یار خوب اڑے۔ وہ مچھندر سپرنٹنڈنٹ جھلا رہا ہوگا۔

کملا۔ اس معرکہ کے جوڑ چھوڑ کر کتابوں میں سر کون مارتا۔ اسکی مدتوں سے آرزو تھی۔

سعید۔ یار آج اُڑ آئے تو کیا حق یہ ہے کہ تمہارا وہاں رہنا ستم ہے۔ دو تو نہ آسکو گے اور یہاں آئے دن نئی نئی سیریں۔ نئی نئی دلچسپیاں۔ کل لال ڈگی پر۔ پرسوں [illegible]ٹ پر۔ ترسوں بٹیرے کا میلہ کہاں تک گناؤں۔

[illegible]لا۔ کل کی کشتی تو بندہ ضرور دیکھے گا۔ چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔

[illegible]ید۔ اور بٹیروں کا میلہ نہ دیکھا تو حسرت رہ جائیگی۔

سہ پہر کے وقت کملا چرن یاران نشاط سے رخصت ہو کر با دلِ ناخواستہ بورڈنگ ہاؤس کی طرف [illegible] میں ایک چوبدار سا بیٹھا ہوا تھا۔ دروازہ پر پہنچکر جھجکا لگا۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب [illegible] کمرہ میں چلا دیا دل مگر دیکھتے ہیں تو وہ

بھی باہر ہی کی طرف آرہے ہیں۔ دل کو خوب مضبوط کرکے اندر داخل ہوا سپرنٹنڈنٹ صاحب بولے۔" اب تک کہاں تھے؟"

لہجہ ایسا درشت تھا کہ کملا چرن بہ مشکل تنکی بہ تنکی جواب دینے سے باز رہا۔ مغرورانہ انداز سے بولا۔" ایک ضرورت سے بازار چلا گیا تھا۔"

سپرنٹنڈنٹ۔ یہ بازار جانے کا وقت نہیں ہے۔

کملا۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔ آئندہ سے احتیاط رکھونگا۔

رات کو جب کملا چارپائی پر لیٹا تو سوچنے لگا۔ یار آج تو بچ گیا مگر مزا تو جب ہو کہ کل بھی بچوں اور پرسوں بھی حضرت کی آنکھوں میں خاک ڈالوں۔ کل کا نظارہ واقعی قابل دید ہوگا۔ کنکوے آسمان سے باتیں کریں گے۔ اڈے ملیں گے پیچ ہونگے۔ نوشا مرزا بلا کی بازی لگاتا ہے۔ یہ خیال کرتے کرتے سوگیا دوسرے دن علی الصباح بورڈنگ ہاؤس سے نکل بھاگا۔ یاران دلنواز لال ڈگی پر اس کے منتظر تھے دیکھتے ہی باغ باغ ہو گئے۔ اور پیچ ٹھوکی

کملا چرن کچھ دیر تک تو کنکوا دیکھتا رہا پھر شوق چرایا کہ کیوں نہ میں بھی اپنے کنکوے منگاؤں اور اپنی تیزدستی کے کرتب دکھاؤں۔ سعید نے بھڑکایا۔ یہ یدکر لڑاؤ۔ روپیہ ہم دینگے پچٹ آ دیکھا نہ تاؤ۔ مکان پر آدمی دوڑا دیا کامل یقین تھا اپنے مانجھے سے یہاں سپھراؤ کر دوں گا۔ مگر آدمی گھر سے خالی ہاتھ لوٹا تب عزت کو تاب نہ رہی۔ بدن میں آگ سی لگ گئی۔ منٹر لیکر دوڑے اور مکان پر آتے ہی کہاروں کو ایک سرے سے سٹر سٹر پیٹنا شروع کیا۔ غریب بیٹھے حقہ تمباکو کر رہے تھے۔ ہنٹر پڑے اور بے خطا بے قصور تو چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ سارے محلے میں ایک شور سا برپا ہوگیا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ ہماری کیا خطا ہے۔ یہاں

کہاروں کی خاطر خواہ مرمت کر کے کملا جان اپنے کمرہ میں پہنچے۔ مگر وہاں کی کیفیت دیکھ کر غصہ بخار کے درجہ تک پہنچ گیا۔ پتنگ پھٹے ہوئے تھے۔ چرخیاں ٹوٹی ہوئی اور مانجھے کی لچھیاں اُلجھی ہوئیں۔ گویا کسی دل جلے نے ان ہوائی جنگ آوروں کا ستیاناس کر دیا۔ سمجھ گئے کہ ضرور اماں نے یہ حرکت کی ہے۔ غصہ سے لال اماں کے پاس آئے اور زور زور سے کہنے لگے "کیوں اماں! کیا تم سچ مچ میری جان ہی لینے پر آ گئی ہو۔ تین دن ہوئے قید خانہ میں بھجوا دیا۔ مگر اتنے پر بھی کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ میری دلچسپی کے جو سامان تھے وہ سب برباد کر ڈالے۔ کیوں؟"

پریموتی۔ (حیرت سے) میں نے تو تمہاری کوئی چیز نہیں چھوئی۔ کیا ہوا؟

کملا۔ (بگڑ کر) جھوٹوں کے منہ میں کیڑے پڑتے ہیں۔ اگر تم نے میری چیزیں نہیں چھوئیں تو کس کی مجال ہے جو میرے کمرہ میں جا کر میرے کنکوے اور چرخیاں سب توڑ پھوڑ ڈالے۔ کیا اتنا بھی نہیں دیکھا جاتا۔

پریموتی۔ تمہارے سر کی قسم میں نے اس کمرہ میں قدم نہیں رکھا۔ چلو دیکھوں کون کون چیزیں ٹوٹی ہیں۔

یہ کہہ کر پریموتی تو اس کمرہ کی طرف چلی اور کملا غصہ میں بھرے آنگن میں کھڑے رہے کہ اتنے میں مادھوی برجن کے کمرہ سے نکلی اور اُن کے ہاتھ میں ایک رقعہ دے کر چلی گئی۔ لکھا ہوا تھا:۔

خطا میں نے کی ہے خطا وار ہوں   سزا دیجئے جو سزاوار ہوں

یہ پُرزہ دیکھتے ہی کملا بھیگی بلی بن گیا۔ دبے پاؤں مردانے کی طرف چلا۔ پریموتی نے پردہ کی آڑ سے سسکتے ہوئے نوکروں کو ڈانٹنا ڈپٹنا شروع کیا تھا۔

اسے منع کیا۔ اور اسی وقت چند اور کنکوے جو بچے ہوئے تھے پھاڑ ڈالے۔ چرخیاں ریزہ ریزہ کر ڈالیں اور ڈور میں دیا سلائی لگا دی۔ ماں اُس کی یہ مجنونانہ حرکت دیکھ رہی تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ماجرا ہے۔ کہاں تو ابھی ابھی انہیں چیزوں کے لئے دنیا سر پہ اُٹھا لی اور کہاں خود ہی اُن کے پیچھے پڑ گئے۔ سمجھی شاید مارے غصہ کے یہ حرکت کر رہا ہے۔ منانے لگی۔ مگر کملا کے چہرہ سے غصہ مطلق ظاہر نہ ہوتا تھا۔ سنجیدگی سے بولا۔ "میں غصہ میں نہیں ہوں۔ آج سے پکا ارادہ کرتا ہوں کہ پتنگ کبھی نہ اڑاؤنگا۔ میری حماقت تھی۔ کہ ان چیزوں کے لئے آپ سے جھگڑ بیٹھا"!

جب کملا چرن کمرہ میں اکیلا رہگیا تو سوچنے لگا۔ بیشک میرے کنکوے اُڑانا اُنہیں ناپسند ہے۔ دل سے نفرت کرتی ہیں۔ ورنہ مجھ پر یہ ظلم ہرگز نہ کرتیں۔ کاش ایکبار اُن سے ملاقات ہوجاتی تو پوچھتا کہ تمہاری کیا مرضی ہے۔ مگر کون منہ دکھاؤنگا۔ ایک تو کوڑھ مغز اس پر اپنی حماقت کے کئی بار ثبوت دے چکا۔ سینہ والے معاملہ کی خبر اُنہیں ضرور ہی ہوئی ہوگی۔ انہیں صورت دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ اب تو یہی علاج ہے کہ یا تو اُنکی صورت دیکھوں اور نہ اپنی دکھاؤں یا کسی طرح کچھ علم حاصل کروں۔ ہائے! ظالم نے کیسی صورت پائی ہے۔ عورت نہیں حور معلوم ہوتی ہے۔ کیا کبھی وہ دن بھی ہونگے کہ میں اسے پیار کرونگا اور میرے پیار کے بدلے وہ بھی مجھے پیار کریگی۔ اسوقت تو شاید میں شادی مرگ ہو جاؤں کیا سُرخ سُرخ رسیلے ہونٹھ ہیں۔ مگر ظالم ہے۔ رحم تو اُسے چھو نہیں گیا۔ کہتی ہے سزا دیجئے۔ جو سزاوار ہوں۔ کیا سزا دوں۔ اگر آجاؤ تو گلے سے لگا لوں اور

انگنت بوسے لوں۔ یہی تمہاری سزا ہے۔ اور بشرط زندگی کبھی نہ کبھی یہ سزا دونگا ضرور۔ اچھا تو اب آج سے پڑھنا چاہیئے۔ یہ سوچتے سوچتے اُٹھا اور ڈربہ کھول کر کبوتروں کو اُڑانے لگا۔ سیکڑوں ہی جوڑے تھے۔ ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر۔ آسمان میں تارے بنجائیں۔ اُڑیں تو دن بھر اُترنے کا نام نہ لیں۔ شہر کے کبوترباز ایک ایک جوڑے کے بدلے غلامی لکھانے کو تیار تھے۔ مگر دم زدن میں سب کے سب اُڑا دئے۔ جب ڈربہ صاف ہو گیا تو کہاروں کو یہ حکم دیا کہ اسے اُٹھا لیجاؤ اور آگ میں جلا دو۔ ورنہ سب کبوتر اس پر آ کر بیٹھ رہیں گے۔ کبوتروں کا قصہ پاک کر کے بیٹروں اور بلبلوں کی طرف مخاطب ہوئے اور اُنہیں بھی بند قفس سے آزاد کر دیا۔

باہر تو یہ گل ہو رہا تھا۔ اندر برج رانی چھاتی پیٹ رہی تھی۔ کہ نہیں معلوم لڑکا کیا کرنے پہ آیا ہے۔ برجن کو بلا کر کہا۔ "بیٹی۔ بچہ کو کسی طرح روکو۔ نہیں معلوم اُس نے دل میں کیا ٹھانی ہے"۔ یہ کہہ کر رونے لگی۔ برجن کو بھی شک ہو رہا تھا کہ ضرور انہوں نے کچھ اور نیت کی ہے ورنہ اس جھلاہٹ کے کیا معنی گو کملا بدشوق تھا۔ بداخلاق تھا۔ آوارہ تھا۔ مگر ان سب عیبوں کے ساتھ اس میں ایک بڑا وصف بھی تھا جسکی کوئی عورت ناقدری نہیں کر سکتی اسے برج رانی سے سچی محبت تھی اور اس کا نادانستہ طور پر کئی بار اظہار ہو چکا تھا یہی سبب تھا جس نے برجن کو اتنا دلیر بنا دیا تھا۔ اُس نے کاغذ نکالا اور یہ رقعہ لکھکر باہر بھیجا:—

پیارے! یہ خفگی کس پر ہے۔ کیا مجھ پر اور محض اسلئے کہ میں نے عجلت

کر کے دو تین کنکوے پھاڑ ڈالے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اتنی سی بات پر ایسے برگشتہ ہو جائینگے تو ہرگز نہیں ہاتھ نہ لگاتی مگر اب خطا ہوگئی معاف فرمایئے یہ پہلی خطا ہے

آپ کی بحج رانی

کملا چرن یہ خط پاکر ایسا خوش ہوا گویا ساری دنیا کی دولت ہاتھ لگ گئی۔ جواب دینے کا شوق چرایا مگر قلم ہی نہیں اُٹھتا۔ نہ القاب ملتا ہے۔ نہ آداب۔ نہ اُٹھان کا خیال ہوتا ہے۔ نہ خاتمہ کا۔ ہر چند چاہتا ہے کہ کوئی عاشقانہ رنگ کا پھڑکتا ہوا خط لکھوں۔ مگر عقل ذرا بھی نہیں دوڑتی۔ آج پہلی بار کملا چرن کو اپنی بے علمی اور جہالت پر رونا آیا۔ افسوس! میں ایک سیدھا سا خط بھی نہیں لکھ سکتا۔ اس خیال سے وہ رونے لگا۔ اور کمرہ کے دروازے بند کر لئے کہ کوئی دیکھ نہ لے

سہ پہر کے وقت منشی شیلا چرن گھر پر آئے تو سب سے پہلی چیز جو نظر پڑی وہ آگ کا الاؤ تھا۔ نوکروں سے متعجب ہو کر پوچھا۔ "یہ کیسا الاؤ ہے"؟

نوکروں نے جواب دیا "حضور ڈربہ جل رہا ہے"۔

منشی جی۔ (گھڑک کر) اسے کیوں جلاتے ہو۔ کبوتر کہاں رہیں گے؟

کہار۔ چھوٹے بابو کا حکم ہے کہ سب ڈربے جلادو۔

منشی جی۔ کبوتر کہاں گئے؟

کہار۔ سب اُڑادیئے ایک بھی نہیں رکھا کنکوے سب پھاڑ ڈالے۔ ڈور جلادی۔ بڑا نقصان کیا۔ کہار نے اپنی دانست میں مار پیٹ کا بدلہ لیا۔ غریب

سمجھا کہ منشی جی اس نقصان کے لئے کملا چرن کو سخت سُست کہیں گے مگر منشی جی نے یہ ماجرا سُنا تو سکتے میں آ گئے۔ انہیں جا لندوں پر کملا چرن جان دیتا تھا۔ آج یکایک کیا کایا پلٹ ہو گئی۔ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ کہار سے کہا بچہ کو بھیج دو۔ ایک منٹ میں کہار نے آ کر کہا۔ "وہ بچہ دروازہ بند ہے اندر سے۔ بہت کھٹکھٹایا کھولتے ہی نہیں"۔

اتنا سُننا تھا کہ منشی جی کا خون خشک ہو گیا۔ فوراً شبہ ہوا کہ بچے نے زہر کھا لیا۔ آج ایک زہر خورانی کا مقدمہ فیصل کر کے آئے تھے۔ ننگے پاؤں دوڑے اور کمرے کے دروازے پر زور سے لات مار کر کہا۔ "بچہ! بچہ!" یہ کہتے کہتے گلا پھنس گیا۔ کملا نے باپ کی آواز سُنی تو فوراً آنسو پونچھ ڈالے اور اٹھ کر دروازہ کھول دیا مگر اُسے کتنا تعجب ہوا جب منشی جی نے بجائے لعن طعن کرنے کے اُسے سینہ سے لپٹا لیا اور گھبرا کر پوچھا:۔ "بچہ! تمہیں میرے سر کی قسم بتا دو تم نے کچھ کھا تو نہیں لیا؟"

کملا چرن نے اس سوال کا مطلب سمجھنے کیلئے منشی جی کی طرف آنکھیں اُٹھائیں تو اُن میں آنسو تھے۔ منشی جی کو اب یقین کامل ہو گیا کہ ضرور آفت آ گئی۔ ایک کہار سے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب کو بلا لا۔ کہنا ابھی چلئے"۔ اب جا کے کُند ذہن کملا باپ کی اس گھبراہٹ کا مطلب سمجھا۔ دوڑ کر اُن سے لپٹ گیا۔ اور بولا:۔ "آپ کا شبہ بالکل بیجا ہے۔ آپ کے سر کی قسم میں بالکل اچھا ہوں" مگر ڈپٹی صاحب کے ہوش اُڑے ہوئے تھے۔ سمجھے یہ مجھے روک کر دیر کیا چاہتا ہے۔ تاکہ اپنا کام تمام کر لے۔ منت کر کے بولے:۔ "بچہ ایشور کے لئے مجھے چھوڑ

بدگمانی

برج رانی کی رخصتی کے بعد صبا ماکا گھر ایسا سونا ہوگیا۔ گویا قفس سے چڑیا اڑ گئی وہ اُس گھر کا اُجالا اور اس جسم کی جان تھی۔ مکان وہی ہے مگر در و دیوار پر حسرت چھائی ہوئی ہے مکین وہی ہیں مگر سب کے چہرے افسردہ اور آنکھیں غمناک ہو رہی ہیں۔ گلشن وہی ہے مگر خزاں رسیدہ۔ رخصتی کے بعد مہینہ بھر کے اندر منشی سنجیون لال بھی تیرتھ جاترا کو سدھارے مال و دولت جو کچھ تھا پرتاپ کو سونپ دیا۔ اپنے ساتھ مرگ چھالا۔ بھگوت گیتا اور چند کتابوں کے سوا اور کچھ نہ لے گئے۔

پرتاپ چند پُرزور محسوسات کا نوجوان تھا مگر اس کے ساتھ ہی ضبط کی انتہائی قوت بھی اُسے حاصل تھی۔ مکان کی ایک ایک چیز اُسے برجن کی یاد دلاتی رہتی۔ یہ خیال دل سے ایک لمحہ کیلئے بھی دُور نہ ہوتا کہ کاش برجن میری ہوتی تو کیسے لطف سے زندگی بسر ہوتی۔ مگر اس خیال کو وہ دُور کرتا رہتا تھا۔ پڑھنے بیٹھتا تو کتاب کھلی رہتی اور خیال کہیں اور جا پہنچتا۔ کھانا کھانے بیٹھتا تو برجن کی صُورت آنکھوں میں پھرنے لگتی۔ جذبۂ محبت کو ضبط کی طاقت سے دباتے دباتے یہ حال ہوگیا گویا برسوں کا مریض ہے۔ عشاق کو اپنی تمنائے دل کے پُوری ہونے کی اُمید ہو یا نہ ہو مگر وہ دل ہی دل میں اپنے معشوق کے دیدار کا لُطف اُٹھاتے رہتے ہیں۔ وہ عالمِ خیال میں معشوق سے باتیں کرتے ہیں۔ چھیڑتے ہیں۔ رُوٹھتے ہیں۔ مناتے ہیں۔ ان تصوّرات سے انہیں تسکین ہوتی۔

ہے اور دل کو ایک پُرمزہ اور خوشگوار شغل ہاتھ آجاتا ہے۔ مگر کاش کوئی طاقت اُنہیں
اس گلشنِ خیال کی سیر کرنے سے روکے۔ کاش کوئی طاقت اُنہیں خیال میں بھی تصویرِ
یار کا دیدار نہ کرنے دے تو اُن بدقسمت بندگانِ محبت کی کیا گت ہوگی۔ پرتاپ انہیں
بدقسمت شخصوں میں تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ چاہتا تو مسرت بخش خیالات کا
لطف اُٹھا سکتا تھا۔ عالمِ خیال کی سیر ظاہری دلچسپیوں سے کم لطف انگیز نہیں ہوتی مگر
مشکل تو یہ تھی کہ ورجن کے خیال کو بھی عاشقانہ جذبات کی آلائش سے پاک رکھنا چاہتا
تھا۔ اسکی تربیت ایسے پاکیزہ اصولوں پر ہوئی تھی اور اُسے ایک نیک نفس پاک باطن بزرگ
کی صحبت سے فیض اُٹھانے کے ایسے اچھے موقعے ملے تھے کہ اُسکی نگاہوں میں خیالات کی
پاکیزگی کی اُتنی ہی وقعت تھی جتنی فعلوں کی پاکیزگی کی۔ یہ کیونکر ممکن تھا کہ ورجن کو
جسے بار ہا بہن کہہ چکا تھا۔ جسے اب بھی بہن سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا عالمِ خیال
میں بھی ایسے تصورات اور جذبات کا مرکز بناتا جو نجاست سے کیسے ہی پاک ہوں
مگر نفسِ سرکش کی حوصلہ افزائیوں سے آزاد نہیں ہو سکتے تھے جبتک منشی سجیون
لال موجود تھے اس کا کچھ نہ کچھ وقت ان کے ساتھ گیان اور معرفت کے چرچوں میں
کٹ جاتا تھا جس سے روح کو کونہ تشفی ہوتی تھی۔ مگر ان کے چلے جانے کے بعد
تربیتِ نفس کے یہ موقعے بھی جاتے رہے۔

سُباما اسے سردمہر اور دل گرفتہ پاتی تو اسے بہت صدمہ ہوتا۔ ایک روز اُس نے
کہا کہ تمہاری طبیعت یہاں نہ لگتی ہو تو کچھ دنوں کے لئے الہ آباد چلے جاؤ۔ وہاں شاید
تمہاری طبیعت بحال ہو جائے۔ یہ خیال پرتاپ کے دل میں کئی بار پیدا ہوا تھا
مگر اس خوف سے کہ اماں کو تنہائی بہت شاق گزریگی اس نے کبھی تجویز پر

غور نہیں کیا تھا۔ ماں کی طرف سے اشارہ پایا تو آمادہ پختہ ہو گیا۔ سفر کی تیاریاں کرنے لگا۔ روانگی کا دن مقرر ہو گیا۔ اب شباما کا یہ حال ہے کہ جب دیکھئے پرتاپ کو پردیس میں رہنے سہنے کے متعلق ہدایتیں کر رہی ہے۔ بیٹا دیکھو کسی سے رار مت مول لینا جھگڑا کرنے کی تو تمہاری ویسے بھی عادت نہیں ہے مگر سمجھائے دیتی ہوں۔ پردیس کا واسطہ ہے پھونک پھونک کر قدم رکھنا۔ کھانے پینے میں بے احتیاطی نہ کرنا۔ تمہاری یہ بڑی بری عادت ہے کہ جاڑوں میں سر شام سے سو جاتے ہو۔ پھر کوئی کھانے کے لئے کتنا ہی جگائے سنتے تک نہیں۔ آپ بھی اُپاس کرتے ہو دوسروں کو بھی اُپاس کراتے ہو۔ یہ عادت پردیس میں بنی رہی تو تمہیں رات کا کھانا کاہے کو میسر ہوگا۔ دن کو ذرا دیر کے لئے آرام کر لیا کرنا۔ تمہاری آنکھوں میں تو دن کو جیسے نیند ہی نہیں رہتی۔ اسے جب موقع ملتا بیٹے کو ایسی ہی مادرانہ نصیحتیں کیا کرتی۔

آخر روانگی کا دن آپہنچا۔ گاڑی دس بجے دن کو چھوٹتی تھی۔ پرتاپ نے سوچا برجن سے ملاقات کر لوں۔ پردیس جا رہا ہوں۔ پھر نہ جانے کب ملاقات ہو۔ دل نے گدگدایا۔ ماں سے کہہ بیٹھا۔ شباما بہت خوش ہوئی۔ ایک طشت میں حلوا اور سموسے اور دو تین قسم کے مربے رکھ کر رندھیا کو دیئے۔ کہ للو کے ساتھ جا۔ پرتاپ نے خط صاف کیا۔ کپڑے بدلے اور بن سنور کر چلے مگر چلے کو تو چلے۔ اب جوں جوں قدم آگے اٹھتا ہے دل بیٹھا جاتا ہے۔ طرح طرح کے خیالات آ رہے ہیں۔ نہ جانے من میں کیا سمجھے کیا نہ سمجھے چار مہینے گزر گئے۔ اس نے مجھے ایک خط بھی تو الگ نہیں لکھا۔ پھر کیسے کہوں کہ میرے ملنے سے اسے خوشی ہوگی! جی اب اسے تمہاری فکر ہی کیا ہے۔ تم مر بھی جاؤ تو وہ آنسو نہ بہائے۔ یہاں کی بات اور تھی وہاں کی بات اور ہے۔ اور مجھے یہ کیا حماقت

سوجھی کہ نیا سوٹ پہنکر آیا۔ یہ ضرور اس کی نگاہوں میں کھٹکیگا۔ کہیں یہ نہ سمجھے کہ لالہ جی بن ٹھن کر مجھے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رجھانے آئے ہیں۔ اسی حیص وبیص میں بڑھتا چلا آتا تھا۔ یہاں تک کہ شیاما چرن کا مکان نظر آنے لگا۔ اور کملا صحن میں چہل قدمی کرتا دکھائی دیا۔ اسے دیکھتے ہی پرتاپ کی وہ کیفیت ہوگئی جو کسی چور کی سپاہی کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ فوراً اس مکان کی آڑ میں چھپ گیا۔ اور ردھیا سے بولا: "جا۔ یہ چیزیں دیتی آ۔ میں ذرا ایک ضرورت سے بازار جا رہا ہوں۔ لوٹتا ہوا آؤنگا" یہ کہکر بازار کی طرف چلا۔ مگر دس ہی قدم گیا کہ پھر مہری کو بلایا اور بولا: "مجھے شاید دیر ہو جائے۔ اس لئے اِدھر نہ آسکونگا۔ کچھ پوچھیں تو یہ پرزہ دیدینا" یہ کہکر جیب سے پنسل نکالی اور چند سطریں لکھ کر دیدیں جس سے اس کی قلب کی کیفیت کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔

میں آج الہ آباد جا رہا ہوں۔ اب وہیں پڑھونگا تم سے عجلت کے باعث نہ مل سکا۔ زندہ رہونگا تو پھر آؤنگا۔ کبھی کبھی اپنی خیر وعافیت سے اطلاع دیتی رہنا۔

تمہارا پرتاپ

پرتاپ تو یہ پرزہ دیکر رخصت ہوا اور ردھیا آہستہ آہستہ برجن کے گھر پہنچی۔ وہ اسے دیکھتے ہی دوڑی اور خیروعافیت پوچھنے لگی "ماما! کیا کوئی چھٹی آئی تھی؟"

ردھیا۔ جب سے گئے چھٹی پتر کچھ نہیں آوا۔

برجن۔ چچی تو آرام سے ہیں؟

ردھیا۔ للو بابو پراگ راج جات ہیں تون تنک اداس رہت ہیں۔

برجن۔ (چونک کر) للو پراگ جا رہے ہیں۔

ردھیا۔ ہاں ہم سب بہت سمجھاوا کہ پردیس میں کہاں جیہو۔ مدا کوؤ کی سنتے ہیں؟

برجن ۔ کب جائیں گے ؟
ردھیا ۔ آج دس بجے کے ٹیم سے جو یا ہیں ملت سے بھینٹ کرن آؤت رہے تو ان دوار پر آئے کے لوٹ گئے ۔
برجن ۔ یہاں تک آکے لوٹ گئے ۔ دروازہ پر کوئی تھا یا نہیں ؟
ردھیا ۔ دوار پر کہاں آتے ۔ سڑک پر سے چلے گئے ۔
برجن ۔ کچھ کہا نہیں کیوں لوٹا جاتا ہوں
ردھیا ۔ کچھ نہیں اتنا بولے کہ ہمار ٹیم چھوٹ جیہے تو ان ہم جانت ہے ۔
برج رانی نے گھڑی پر نگاہ ڈالی ۔ آٹھ بجنے والے تھے ۔ پریموتی کے پاس جاکر بولی :۔ اماں ! للو آج الہ آباد جا رہے ہیں ۔ اگر آپ کہیں تو ذرا ان سے ملتی آؤں پھر نہ جانے کب ملنا ہو کب نہ ہو ۔ مہری کہتی ہے کہ وہ مجھ سے ملنے آئے تھے ۔ مگر وہ سڑک کے اسی پار سے لوٹ گئے ۔
پریموتی ۔ ابھی نہ بال گندھوائے نہ مانگ بھروائی نہ کپڑے بدلے اور چلنے کو تیار ہو گئیں
برجن میری اماں جی آج جانے دیجئے ۔ بال وال گندھوانے بیٹھوں تو دس یہیں بج جائیں گے ۔
پریموتی ۔ اچھا تو جاؤ ۔ مگر شام تک لوٹ آنا ۔ گاڑی تیار کرالو ۔ میری طرف سے سشیلا کو پالاگن کہدینا ۔ برجن لپکی ہوئی کمرہ میں آئی ۔ کپڑے بدلے ۔ مادھوی کو باہر دوڑایا کہ گاڑی تیار کرنے کے لئے کہہ آ ۔ تب تک کچھ خیال آیا ۔ ردھیا سے پوچھا ۔ " کچھ چٹھی پترہ نہیں دیا ۔

بڑھیا نے پرچہ نکالکر دیدیا۔ برجن نے اسے بڑے شوق سے لیا مگر اُسے پڑھتے ہی اُس کا چہرہ کملا گیا۔ سوچنے لگی کہ وہ دروازہ تک آکر کیوں لوٹ گئے اور خود بھی لکھا تو ایسا اکھڑا۔ مہمل۔ چہ خوش! ہم سے عجلت کے باعث نہ مل سکے۔ ایسی کیا عجلت تھی۔ کیا گاڑی کے نوکر تھے۔ دن بھر میں کچھ نہیں تو پانچ چھ گاڑیاں جاتی ہونگی کیا مجھ سے ملنے کے لئے اُن سے دو گھنٹہ کی دیر بھی برداشت نہ ہو سکی۔ ضرور اس میں کچھ نہ کچھ راز ہے۔ مجھ سے کونسی خطا ہوئی۔ یکایک اُسے اس وقت کی یاد آئی۔ جب وہ عالمِ بیقراری میں پرتاپ کے پاس گئی تھی اور اُس کی زبان سے نکلا تھا:۔ "للو مجھ سے صبر کیسے ہوگا۔" برجن کو اب سے پہلے کئی بار خیال آچکا تھا کہ میرا اسوقت کا اور اس حالت میں جانا بہت ہی نامناسب تھا۔ اُسوقت یقین ہوگیا۔ کہ میں ضرور للو کی نگاہوں میں گر گئی۔ میری محبت اور عزت اب اُن کے دل میں نہیں ہے۔ ایک ٹھنڈی سانس لیکر بیٹھ گئی۔ اور مادھوی سے بولی:۔ "کوچبان سے کہدے گاڑی نہ تیار کرے میں نہ جاؤنگی"

فرض اور محبت کی کشمکش

. وقت تک برج رانی سُسرال نہ آئی تھی۔ اسکی نگاہوں میں ایک مثالی پتی برتا عورت کے فرائض اور ذمہ داریوں کا کوئی اعلیٰ معیار نہ قایم ہُوا تھا۔ گھر میں کبھی اُس کے شوہر کا ذکر نہ آتا یا اگر آتا تو ناخوشگوار طریقے پر۔ اُس نے استری دھرم کی کتابیں بھی پڑھی تھیں مگر ان کا کوئی دیرپا اور متحرک اثر اُس پر نہ ہُوا تھا غالباً اُسے یہ خیال ہی نہ آتا۔ کہ یہ گھر میرا نہیں ہے اور مجھے بہت جلد یہاں سے جانا پڑیگا۔

مگر جب وہ سُسرال میں آئی اور اپنے دل وجان کے مالک۔ اپنے آقا اپنے شوہر کو ہر دم آنکھوں کے سامنے دیکھنے لگی تو رفتہ رفتہ اُس کے دل کی کیفیت متغیر ہونا شروع ہُوئی۔ روشن ہُوا کہ میں کون ہُوں اور مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ میرا کیا دھرم ہے اور مجھے کس طرح اپنا دھرم نباہنا چاہیئے۔ اگلی باتیں خواب سی معلوم ہونے لگیں۔ ہاں جسوقت یاد آجاتا کہ کم از کم ایک خطا مجھ سے ایسی ہُوئی ہے جسکی میں تلافی نہیں کرسکتی تو وہ خود بخود شرم سے سر جھکا لیتی اور اپنے تئیں کوستی۔ اسے تعجب ہوتا کہ للو کے سامنے جانے کی مجھے کیونکر جرأت ہوئی۔ شاید اس واقعہ کو خواب سمجھنے کی کوشش کرتی۔ تب للو کی شریفانہ صورت اُس کے پیش نظر ہو جاتی۔ اور وہ صدق دل سے اسے دعا دیتی۔ روز بروز اُس کی محبت اور عزت دل میں زیادہ

ہوتی جاتی تھی۔

لیکن آج جب پرتاپ چند کی تلون مزاجی سے اُسے یہ خیال کرنے کا موقع ملا کہ للّو اس واقعہ کو ابھی بھولا نہیں ہے اور اسکی نگاہوں میں میری وقعت نہیں رہی۔ یہانتک کہ وہ میری صورت دیکھنے کا بھی روادار نہیں ہے تو اسے حسرتناک غصّہ پیدا ہوا۔ پرتاپ کی طرف سے طبیعت منغض ہو گئی اور اُس کی جو محبّت اور عزت دل میں تھی وہ دم زدن میں پانی کے انجرات کی طرح غائب ہونے لگی۔ عورتیں انتہا درجہ کی ذکی الحس ہوتی ہیں۔ وہ جتنی پُر دلی اور یکسوئی سے محبّت کر سکتی ہیں اُتنی ہی سرگرمی سے نفرت بھی کر سکتی ہیں۔ جس پرتاپ کے لئے وہ اپنی ہستی خاک میں ملا دینے کو تیار تھی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ اُس کے ایک طفلانہ فعل کو بھی درگذر نہیں کر سکتا۔ کیا اس کا دل ایسا تنگ ہے! یہ خیال برجن کے پہلوئے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگا۔

آج سے برجن کی زندہ دلی رخصت ہو گئی۔ دل پر ایک بوجھ سا رہنے لگا۔ سوچتی کہ جب پرتاپ مجھے بھول گئے اور میری رتی بھر بھی عزت نہیں کرتے تو اس صدمہ سے میں کیوں اپنی جان کھپاؤں۔ جیسے رام تلسی سے ویسے تلسی رام سے اگر انہیں مجھ سے نفرت ہے۔ اگر وہ میری صورت سے بیزار ہیں تو میں بھی اُن کی صورت سے متنفر ہوں اور مجھے بھی اُن سے ملنے کی خواہش نہیں۔ تب وہ اپنے ہی اوپر جھنجھلا اُٹھتی۔ کہ میں ہر دم انہیں کی باتیں کیوں سوچا کرتی ہوں اور اسا رادہ کرتی۔ کہ اب اُن کا خیال بھی دل میں نہ آنے دونگی مگر ذرا دیر میں خیال پھر اسی طرف جا پہنچتا اور وہی خیالات بے چین کرنے لگتے۔ قلبی اور خیالی انتقام کے جوش میں وہ کملا چرن سے خلوص محبّت کا اظہار کرنے لگی۔ وہ ذرا دیر کے لئے کہیں چلا جاتا تو اُس سے

شکایت کرتی جتنے نقد روپے جمع کر رکھے تھے وہ سب اسے دیدیئے کہ اپنے لئے
سونے کی گھڑی اور طلائی چین خریدے۔ کملا نے ذرا انکار کیا تو آبدیدہ ہو گئی۔ وہ
یوں بھی اُس کا غلام بنا ہوا تھا۔ اُس کی محبت کا یہ رنگ دیکھکر اور بھی جان دینے لگا۔
دوستوں نے سُنا تو مبارکبادیں دینے لگے۔ میاں حمید اور سعید اپنی اپنی قسمتوں کو کوسنے
لگے کہ ایسی محبتی بیوی ہم کو نہ ملی۔ تمہیں وہ بنا مانگے ہی یوں سرفراز کرتی ہیں اور یہاں
بیویوں کی فرمائشوں کے مارے ناک میں دم ہے۔ چاہے اپنے پاس کانی کوڑی نہ ہو مگر
اُن کی فرمائشیں ضرور پوری ہونی چاہئیں ورنہ طوفانِ نوح برپا ہو جائے گا۔ اجی اور کیا
کہیں کبھی گھر میں ایک بیڑے پان کے لئے چلے جاتے ہیں تو وہ بھی بے دس پانچ الٹی
سیدھی سُنے نصیب نہیں ہوتا۔ خدا ہم کو بھی تمہاری سی بیوی عطا کرے۔
یہ سب تھا۔ کملا چرن بھی محبت کرتا تھا اور برج رانی بھی محبت کرتی تھی مگر
دونوں کے ملنے سے جو مسرت حاصل ہوتی ہے برجن کے چہرہ پر اس کا مطلق نشان
نہ تھا۔ روز بروز ندار و نحیف ہوتی جاتی تھی۔ کملا چرن قسمیں دے دیکر پوچھتا کہ تم
دُبلی کیوں ہوتی جاتی ہو۔ اُسے خوش رکھنے کی جو تدبیریں بن پڑتیں کیا کرتا۔ یار دوستوں سے
بھی اس اہم معاملہ میں مشورہ لیتا مگر کچھ کارگر نہ ہوتا تھا۔ برج رانی ہنسکر کہہ
دیا کرتی۔ کہ تم کچھ فکر مت کرو۔ میں بالکل اچھی ہوں۔ یہ کہتے کہتے اُٹھکر اُسکے بالوں
میں کنگھی کرنے لگتی یا پنکھا جھلنے لگتی۔ ان خاطر داریوں سے کملا چرن پر جنوں
کا سرور ہو جاتا۔ مگر لکڑی کے اُوپر رنگ و روغن لگانے سے وہ کیڑا نہیں مرتا جو
اندر بیٹھا ہوا اُسکا کلیجہ کھائے جاتا ہے۔ یہ خیال کہ پرتاپ چند مجھے بھول گئے اور
میں اُنکی نظروں میں گر گئی۔ ناسور کی طرح اُسکے کلیجہ میں چھید کیا کرتا تھا۔ اُسکی

حالت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ یہانتک کہ بستر پر سے اُٹھنا مشکل ہو گیا۔ ڈاکٹروں کا علاج ہونے لگا۔

اُدھر پرتاپ چند کی طبیعت الہ آباد میں سنبھل چلی تھی۔ ورزش کا تو اُسے شوق تھا ہی وہاں اس کا خوب چرچا تھا۔ غم غلط کرنے کا اچھا مشغلہ ہاتھ آیا دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے جسمانی محنت سے بڑھکر اور کوئی علاج نہیں ہے۔ صبح کو جمناسٹک اور کشتی شام کو کرکٹ اور فٹ بال۔ آٹھ نو بجے رات تک باغیچوں کی سیر اتنی محنت کے بعد چارپائی پر گرتا تو سویرے آنکھ کھلتی چھ مہینوں میں کرکٹ اور فٹ بال کا کپتان بن بیٹھا اور دو تین میچ ایسے معرکے کے کھیلے کہ سارے شہر میں دھوم مچ گئی۔

آج علیگڑھ کی ایک زبردست ٹیم سے اُن کا کرکٹ میں مقابلہ تھا۔ یہ ٹیم ہندوستان کی مشہور ٹیموں کو شکست دیتی۔ فتح کا ڈنکا بجاتی ہوئی یہاں پہنچی تھی۔ انہیں غالباً اپنی فتح کی جانب سے بہت اندیشہ نہ تھا۔ وہ کئی مضبوط ٹیموں سے پالا مار چکے تھے مگر اس کے ساتھ ہی الہ آباد والے مایوس نظر آتے تھے۔ اُنکی امیدیں پرتاپ چند سے وابستہ تھیں اگر وہ آدھ گھنٹہ بھی جم گیا تو رنوں کے انبار لگا دیگا اور اگر اتنی ہی دیر تک گیند چل گیا تو پھر اُدھر کا صفایا ہے۔ پرتاپ کو کبھی اتنا بڑا میچ کھیلنے کا اتفاق نہ تھا۔ کلیجہ بانسوں اُچھل رہا تھا کہ جانے کیا نتیجہ ہو۔ دس بجے کھیل شروع ہوا۔ پہلے علیگڈھ والوں کے کھیلنے کی باری تھی اور دو ڈھائی گھنٹہ تک انہوں نے خوب جوہر دکھلائے۔ ایک بجتے بجتے کھیل کا پہلا حصہ ختم ہوا۔ علیگڈھ نے ۴۰۰ رن کئے۔

اب الہ آباد والوں کی باری آئی۔ مگر کھلاڑیوں کے ہاتھ پاؤں پھولے ہوئے تھے
یقین ہوگیا کہ بس طرح یا ہے۔ اب عہدہ برآ ہونا محال ہے۔ اتنے رن کون کریگا
اکیلے پرتاپ کیا بنا لیگا۔ پہلا کھلاڑی آیا اور تیسرے گیند میں رخصت دوسرا
آیا اور مشکل سے پانچ گیند کھیل سکا۔ تیسرا آیا اور پہلے ہی گیند میں کیچ ہوگیا
چوتھے نے آکر دو تین معرکے کے ہٹ لگائے مگر جم نہ سکا۔ پانچویں صاحب
بلاک کرنے میں شہر کا کالج تھے مگر یہاں اُن کی بھی کچھ نہ چلی۔ تھاپی سکتے ہی غائب
ہوگئے۔ اب پرتاپ چند متانت سے قدم اُٹھاتا۔ بیٹ گھماتا میدان میں آیا۔
طرفین نے تالیاں بجائیں۔ الہ آبادیوں کی کیفیت بیان میں نہیں آسکتی۔ ہر شخص
کی نگاہیں پرتاپ چند کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ سب کے دل دھڑ دھڑ کررہے
تھے۔ چوطرفہ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کچھ لوگ دور بیٹھے ہوئے خدا سے دعا کررہے
تھے کہ پرتاپ سرخرو لوٹے۔ دیوی اور دیوتا یاد کئے جا رہے تھے۔ پہلا گیند آیا۔
پرتاپ نے خالی دیا۔ الہ آبادیوں کے دل اریج بھر بیٹھ گئے۔ دوسرا گیند آیا وہ بھی
خالی گیا۔ الہ آبادیوں کے دل ناف تک پہنچ گئے۔ بہت سے آدمی چھتری سنبھال
گھر کی طرف چلے۔ تیسرا گیند آیا۔ ایک پٹاخے کی آواز ہوئی اور گیند شہاب ثاقب کی
طرح آسمان کو چیرتا ہوا ہٹ پر کھڑے ہونے والے فیلڈر سے سو گز کے فاصلے پر
گرا۔ الہ آبادیوں نے تالیاں بجائیں۔ سوکھے دھان میں پانی پڑا۔ جانے والے ٹھٹک گئے
مایوسوں نے پیٹھ سیدھی کی۔ دوسرا گیند آیا اور پہلے والے گیند سے دس گز آگے گرا۔
فیلڈر چونکے ہٹ پر کمک پہنچائی۔ پانچواں گیند آیا اور کٹ پر گیا۔ اتنے میں اوور
ختم ہوا بولر بدلے۔ یہ نئے بولر پورے قاتل تھے۔ مہلک گیند پھینکتے تھے۔ مگر اُن کے

پہلے ہی گیند کو پرتاپ نے سورج سے بات کرنے کے لئے آسمان کی طرف بھیجا پھر تو
گیند اور اُسکی تھاپی میں سازش سی ہوگئی۔ گیند آتا اور تھاپی سے بغلگیر ہوکر کبھی پورب
کی راہ لیتا کبھی پچھم کی، کبھی اُتر کی، کبھی دکھن کی۔ فیلڈروں کا دبڈتے دوڑتے ناک میں
دم تھا۔ الہ آباد والے اُچھلتے تھے، بغلیں بجاتے تھے۔ ٹوپیاں ہوا میں اُچھل رہی تھیں
ایک صاحب نے روپیے نکالکر لٹادئے۔ دوسرے صاحب نے اپنی سنہری زنجیر لٹادی۔
حریف دل میں جلتے، جھنجھلاتے۔ کبھی میدان کی ترتیب بدلتے، کبھی بولر تبدیل کرتے
مگر سب تدبیریں اور چالیں بے اثر ہو رہی تھیں۔ گیند کا تھاپی سے یارانہ ہوگیا تھا۔

کامل دو گھنٹوں تک پرتاپ پیٹا کئے اور بگولے اور ہوائیاں چھوڑتا رہا اور
فیلڈر گیند کی طرف یوں لپکتے جیسے بچے چاند کی طرف لپکتے ہیں۔ رنوں کی تعداد تین سو
تک پہنچ گئی۔ حریفوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ ایسے حواس باختہ ہو رہے تھے کہ ایک گیند
بھی سیدھا نہ آتا تھا۔ فیلڈ میں بے ترتیبی پھیلی ہوئی تھی یہاں تک کہ پرتاپ نے پچاس رن
اور لے کئے اور اب اُس نے امپائر سے ذرا دم لینے کی مہلت مانگی۔ اُسے آتے دیکھ کر
ہزاروں آدمی اُسکی طرف لپکے اور اسے باری باری سے گود میں اُٹھانے لگے۔ چاروں طرف
بھگدڑ مچ گئی۔ سیکڑوں چھاتے، چھتریاں، ٹوپیاں اور جوتے عالم بالا کی سیر کرنے لگے۔
گویا وہ بھی فرطِ مسرت سے اُچھلے پڑتے تھے۔ عین اسی وقت تار گھر کا چپراسی بائیسکل
پر آتا ہوا دکھائی دیا۔ قریب آکر بولا۔ "پرتاپ چند کس کا نام ہے؟" پرتاپ نے چونک
کر اُسکی طرف دیکھا اور چپراسی نے تار کا لفافہ اُس کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ پڑھتے ہی پرتاپ
کا چہرہ زرد ہوگیا۔ ٹھنڈی سانس لیکر کرسی پر بیٹھ گیا اور بولا "یارو اب میچ کا فیصلہ
تمہارے ہاتھ ہے۔ میں نے اپنا فرض ادا کردیا۔ اسی ڈاک سے مکان چلا جاؤنگا۔"

یہ کہکر وہ بورڈنگ ہاؤس کی طرف چلا۔ سیکڑوں آدمی پوچھنے لگے کیا ہے کیا ہے؟
لوگوں کے چہروں پر مُردنی چھاگئی مگر اُسے بات کرنے کی کہاں فرصت۔ اُسیوقت ٹرین پر
بیٹھا اور بنارس کی طرف روانہ ہوگیا۔

راستہ بھر اُس کا دل تشویشوں کی جولانگاہ بنا رہا۔ بار بار اپنے کو نفرین کرتا کہ
میں نے چلتے وقت کیوں نہ اُس سے مل لیا۔ اب نہ جانے ملاقات ہو یا نہ ہو۔ اگر خدانخواستہ
اُسکی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی تو میں بھی مُنہ میں کالکھ لگا کر کہیں مر رہونگا۔ یہی
باتیں سوچکر کبھی بلبلا دیا۔ نو بجے شب کو گاڑی بنارس پہنچی اُس پر سے اُترتے ہی سیدھا
شیاما چرن کے مکان کی طرف چلا۔ فرط ملال سے آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور کلیجہ
دھڑک رہا تھا۔ ڈپٹی صاحب کرسی پر سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے اور کملا ڈاکٹر صاحب
کے یہاں جانے کو تیار کھڑا تھا۔ پرتاپ چندر کو دیکھتے ہی دوڑ کر لپٹ گیا۔ شیاما چرن
نے بھی گلے لگایا اور بولے: "کیا بھی سیدھے الہ آباد سے چلے آرہے ہو؟"
پرتاپ۔ جی ہاں آج ایک تار پہنچا کہ برجن کی حالت بہت خراب ہے کیا
ابھی وہی حالت ہے؟
شیاما چرن۔ کیا کہوں۔ ادھر دو تین ہفتہ سے روز بروز کمزوری ہوتی جاتی ہے۔
دواؤں کا مطلق اثر نہیں ہوتا۔ دیکھیں ایشور کو کیا منظور ہے۔ ڈاکٹر
صاحب تو کہتے تھے تپ دق ہے مگر حکیم صاحب ضعف جگر بتلاتے ہیں۔
برجن کو جب سے خبر ملی کہ پرتاپ چندر آئے ہوئے ہیں تب سے اس کے دل میں اُمید
اور بیم کی گھڑدوڑ مچی ہوئی تھی۔ کبھی سوچتی کہ گھر آئے ہونگے چچی نے زبردستی ٹھیل ٹھالکر
یہاں بھیجدیا ہوگا۔ پھر خیال ہوتا شاید میری بیماری کی خبر پائی ہو۔ گھبرا کر چلے آئے

ہوں۔ مگر نہیں انہیں میری ایسی کیا فکر پڑی ہے۔ سوچا ہوگا کہیں مر نہ جائے۔ لاؤ چلو دنیا کا برتاؤ تو کرتا آدمی۔ انہیں میرے مرنے جینے کا کیا غم۔ آج میں بھی حضرت سے بھی کھول کر باتیں کرونگی۔ لیکن نہیں۔ باتوں کی ضرورت ہی کیا ہے۔ انہوں نے چُپ سادھی ہے تو میں کیوں بولوں بس اتنا کہدونگی کہ بہت اچھی طرح ہوں اور تمہاری خیریت کی دعا کرتی رہتی ہوں پھر زبان نہ کھولونگی۔ اور جب یہ میلی کچیلی ساری پہنے کیوں بیٹھی ہوں۔ جو اپنا ہمدرد نہ ہو اُس کے آگے یہ صورت بنائے رکھنے سے فائدہ۔ وہ مہمان کی طرح آتے ہیں میں بھی مہمان کی طرح اُن سے پیش آؤنگی۔ الہ! انسان کا دل کیسا پیچیدہ ہے! جس شخص کی سرد مہری کے خیال نے برجن کی یہ گت بنا رکھی تھی اُسی کو جلانے کے ایسے ایسے منصوبے باندھ رہی ہے۔

دس بجے کا وقت تھا۔ مادھوی بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔ دواؤں کی شیشیاں اِدھر اُدھر پڑی ہوئی تھیں اور برجن چارپائی پر پڑی یہی سب باتیں سوچ رہی تھی کہ پرتاپ کمرہ میں داخل ہوا مادھوی چونک کر بولی "بہن اُٹھو۔ آ گئے"۔ برجن ہک بکا کر اٹھی۔ اور چارپائی سے اُترنا چاہتی تھی کہ ضعف کے مارے زمین پر گر پڑی۔ پرتاپ نے لپک کے اُسے سنبھالا اور چارپائی پر لٹا دیا۔ آہ! یہ وہی برجن ہے جو آج سے چند ماہ قبل حسن و شباب کی مورت تھی۔ جس کے مکھڑے پر چمک اور آنکھوں میں ہنسی کا بسیرا رہتا تھا۔ جس کا بولنا شیاما کا گانا اور ہنسنا من کا لبھانا تھا۔ وہی رسیلی آنکھوں والی میٹھی باتوں والی برجن اب ایک تودۂ استخوان ہو گئی ہے۔ پہچانی نہیں جاتی۔ پرتاپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مزاج کی کیفیت پوچھنا چاہتا تھا مگر منہ سے صرف اتنا نکلا۔ "برجن" اور آنکھوں سے اشک کے قطرے ٹپکنے لگے۔

محبّت کی آنکھیں جذبات کے پرکھنے کی کسوٹی ہیں۔ برجن نے آنکھ اٹھا کر دیکھا اور اُن چند قطرہائے اشک نے اُس کے دل کا سب غبار دھو دیا۔

جیسے کسی فوج کا سپہ سالار جو آنے والی لڑائی کا نقشہ دل میں سوچ رہا ہو غنیم کو اپنی پشت پر دیکھ کر بدحواس ہو جاتا ہے اور مجوزہ نقشہ کا خیال بھی اُسے نہیں رہتا۔ اُسی طرح برجن پرتاپ چند کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ سب باتیں بھول گئی جو وہ ابھی بڑی بڑی سوچ رہی تھی وہ پرتاپ کو روتے دیکھ کر اپنا سب دُکھ بھول گئی اور چارپائی سے اُٹھ کر آنچل سے اُس کے آنسو پونچھنے لگی۔ پرتاپ جیسے خطاوار کہہ سکتے ہیں اس وقت مظلوم کی حیثیت میں تھا اور برجن جس نے اپنے تئیں گھلا گھلا کر اس حالت کو پہنچا دیا تھا رو رو کر اس سے کہہ رہی تھی۔ للّو چپ رہو۔ ایشور جانتا ہے میں بالکل اچھی ہوں گویا اچھا نہ ہونا اُس کی خطا تھی۔ عورتوں کے احساسات کیسے نازک ہوتے ہیں۔ پرتاپ کی ایک ذراسی بےمحل انکاری نے برجن کو اس زندگی سے لاپروا بنا دیا تھا۔ اور آج آنسو کی چند بوندوں نے اس کے دل کی وہ جلن وہ سوزوہ آگ بجھا دی جو کئی مہینوں سے اُس کے خون اور جگر کو جلا رہی تھی

جو مرض بڑے بڑے حکیموں اور ڈاکٹروں کے علاج سے دور نہ ہوا اُسے آنسو کے چند قطروں نے دم زدن میں دور کر دیا۔ کیا یہ پانی کے قطرے امرت کی بوندیں تھیں؟

پرتاپ نے ضبط کر کے پوچھا۔ "برجن! یہ تم نے اپنی کیا گت بنا رکھی ہے؟"

برجن۔ (مسکرا کر) یہ گت میں نے نہیں بنائی۔ تم نے بنائی ہے۔

پرتاپ۔ اماں کا تار نہ پہنچتا تو مجھے اطلاع بھی نہ ہوتی۔

برجن۔ ضرورت کیا تھی۔ جیسے بھلانے کے لئے الہ آباد چلے گئے۔ اس کے مرنے جینے

کی تھی۔ کیا پروا؟

پرتاپ۔ باتیں بنا رہی ہو۔ غیروں کو کیوں خط لکھتیں۔

برجن۔ کسے اُمید تھی کہ تم اتنی دُور سے آنے کی یا خط لکھنے کی زحمت اُٹھاؤ گے جو دروازہ سے آکر پھر جائے اور صورت دیکھنے تک کا روادار نہ ہو اُسے خط بھیجکر کیا کرتی

پرتاپ۔ اُس وقت لوٹ جانے کا جتنا صدمہ مجھے ہوا میرا دل ہی جانتا ہے۔ تم نے اس وقت تک میرے پاس کوئی خط نہیں لکھا تھا۔ میں نے سمجھا اب یاد دل سے جاتی رہی۔

برجن۔ اگر میں تمہاری باتوں پر اعتبار کرنیکی عادی نہ ہوتی تو اسوقت کہہ دیتی۔ یہ سب سوچی ہوئی باتیں ہیں۔

پرتاپ۔ خیر جیسا سمجھو۔ اب یہ بتاؤ کہ طبیعت کی کیا کیفیت ہے۔ میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔ ایسا چہرہ اُتر گیا ہے۔

برجن۔ اب اچھی ہو جاؤنگی۔ دوا مل گئی۔

پرتاپ کنایہ سمجھ گیا۔ افسوس! میری ذرا سی غلطی نے یہ قیامت ڈھا دی۔ دیر تک اُسے سمجھاتا رہا اور علی الصباح جب وہ اپنے گھر چلا تو برجن کا چہرہ کھلا ہوا تھا اسے یقین ہو گیا کہ للو مجھے بھولے نہیں ہیں اور میری یاد اور عزت اُن کے دل میں قائم ہے۔ پرتاپ نے اُس کے جگر سے وہ کانٹا نکال دیا جو کئی مہینوں سے کھٹک رہا تھا اور جس نے اُسکی یہ حالت کر دی تھی۔ ایک ہی ہفتہ میں اُس کا مکھڑا کندن کی طرح دمکنے لگا۔ گویا کبھی بیمار ہی نہ تھی۔

——— ٭٭٭ ———

فرض کی جیت اور محبت کی ہار

مریض جبتک بیمار رہتا ہے اُسے خبر نہیں ہوتی کہ کون میری تیمارداری کر رہا ہے۔ کون میری عیادت کے لئے آتا ہے وہ اپنی ہی تکلیفوں میں اسقدر محو رہتا ہے کہ کسی دوسری بات کا خیال ہی اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتا مگر جب اُسے صحت ہو جاتی ہے تو اپنے تیمارداروں کی توجہ اور پریشانی۔ سرگرمی اور جانفشانی کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔ اور اُس کے دل میں ان کی محبت اور عزت زیادہ ہو جاتی ہے۔ بعینہ یہی حال برج رانی کا تھا۔ جبتک وہ خود آزارِ دل میں مبتلا تھی کملاچرن کی حیرانیوں اور پریشانیوں کا اندازہ نہ لگا سکتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اُسکی خاطرداری میں کوئی بات اُٹھا نہ رکھتی مگر یہ خاطرداریاں ایک فرضی انتقام کے خیال سے ہوتی تھیں نہ کہ سچی محبت سے لیکن جب اُس کے جگر سے غم کا کانٹا نکل گیا تو کملا کی دوا دوش اور سرگردانیاں یاد آئیں اور یہ فکر پیدا ہوئی کہ ان عنایات بیکراں کا جواب کیونکر دوں۔ میرا دھرم تھا کہ اپنی ذات سے اُنہیں آرام پہنچاتی مگر آرام کا تو کیا ذکر میں تو اُلٹے اُنکی جان کی گاہک ہوئی ہوں۔ وہ تو ایسے سچے دل سے میری محبت کریں اور میں اپنے فرائض بھی نہ ادا کر سکوں۔ ایشور کو کیا منہ دکھاؤنگی سچی محبت کا کنول بسا اوقات احسان کے اثر سے کھل جایا کرتا ہے۔ جہاں حسن و شباب و دولت و جاہ اور محاسن ذاتی محبت کا بیج بونے میں ناکام رہتے ہیں وہاں اکثر احسان کا جادو چل جاتا ہے۔ کوئی دل ایسا سخت اور سرد نہیں ہو سکتا جو سچی خدمت

کے احسان سے پگھل نہ جائے۔

کملا اور برج رانی میں روز بروز اخلاص اور پیار بڑھنے لگا۔ ایک بندۂ محبت تھا اور دوسری کنیز فرض ممکن نہ تھا کہ برج رانی کی زبان سے کوئی بات نکلے اور کملا چرن اسکے پورے کرنے کی دل و جان سے کوشش نہ کرے۔ اب اسکی محنت اور لیاقت انہیں کوششوں میں صرف ہوتی تھی۔ پڑھنا صرف والدین کو دھوکہ دینے کا ایک وسیلہ تھا وہ ہمیشہ اسکی طبیعت کا رنگ دیکھتا رہتا اور اس امید پر کہ یہ کام اسکی خوشی کا باعث ہوگا وہ سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔ ایک روز اس نے مادھوی کو پھلواڑی میں پھول چنتے دیکھا یہ چھوٹا سا باغیچہ مکان کے پشت پر واقع تھا۔ مگر چونکہ کنبہ کے کسی فرد کو اس سے دلی ہمدردی نہ تھی۔ اس لئے بارھوں مہینے اس پر خزاں کا دور رہتا تھا۔ برج رانی کو پھولوں سے خلقی محبت تھی پھلواڑی کی یہ درگت دیکھی تو مادھوی کو تاکید کی کہ کبھی کبھی اس میں پانی دیدیا کرو۔ رفتہ رفتہ باغیچہ کی حالت کچھ کچھ سنبھل چلی اور بعض بعض پودوں میں پھول نظر آنے لگے۔ کملا چرن کے لئے اتنا اشارہ کافی تھا۔ دل و جان سے باغیچہ کے سنوارنے پر تُل گیا۔ دو ہوشیار مالی نوکر رکھ لئے۔ قسم قسم کے خوشرنگ پھول اور پودے لگائے جانے لگے۔ انواع و اقسام کی گھاسیں اور پتیاں گملوں میں سجائی جانے لگیں۔ چمن اور روشیں درست ہونے لگیں۔ جابجا لتائیں چڑھا دی گئیں۔ کملا چرن دن کے دن کتاب ہاتھ میں لئے باغیچہ میں ٹہلتا رہتا اور مالیوں سے باغیچہ کی بناوٹ اور سجاوٹ کی تاکید کرتا رہتا۔ وہ صرف اس لئے کہ برجن خوش ہوگی۔ ایسے بندۂ رضا کا جادو کس پر نہ چل جائیگا۔ ایک روز کملا نے کہا آؤ تمہیں باغیچہ کی سیر کراؤں۔ برج رانی تیار ہو گئی۔ چاند نکل آیا تھا اور اسکی روشنی میں پھول اور پودے بہت سہانے معلوم

ہوتے تھے۔ دھیمی دھیمی ہوا چل رہی تھی اور موتیے اور بیلے کی لپٹیں دماغ کو معطر کیے دیتی تھیں۔ ایسے وقت میں برجن ایک ملگجی ریشمی ساڑی اور ایک نفیس مخملی سلیپر پہنے روشوں میں ٹہلتی نظر آئی۔ اس کے چہرہ کی ملاحت پھولوں کو شرمندہ کر رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ پھول کی دیوی ہے۔ کملا چرن بولے:۔ "آج محنت سپھل ہوگئی"

جیسے تمغے میں گلال بھرا ہوتا ہے اُسی طرح برجرانی کی آنکھوں میں محبت کا رس بھرا ہوا تھا۔ وہ مسکرائی، مگر زبان سے کچھ نہ بولی۔

کملا۔ مجھ جیسا خوش نصیب آدمی دُنیا میں نہ ہوگا۔

برجن۔ کیا مجھ سے بھی زیادہ؟

کملا متوالا ہو رہا تھا۔ برجن کو پیار سے گلے لگا لیا۔

کچھ دنوں تک روزانہ یہی معمول رہا۔ اسی اثنا میں تازہ دلچسپیوں کے سامان پیدا ہو گئے۔ رادھا چرن نے تصویروں کا ایک خوبصورت البم برجن کے پاس بھیجا۔ اس میں کئی تصویریں چندرا کی موجود تھیں کہیں وہ بیٹھی شیاما کو پڑھ رہی ہے۔ کہیں بیٹھی ہوئی خط لکھ رہی ہے۔ اس کی ایک تصویر مردانہ لباس میں بھی تھی۔ رادھا چرن فوٹو گرافی کے فن سے بھی واقف تھے۔ برجن نے یہ البم بہت پسند کیا۔ پھر کیا تھا۔ کملا کو دُھن سوار ہوئی کہ میں بھی تصویر کشی میں مہارت حاصل کروں اور برجن کی تصویر کھینچوں۔ بھائی کے پاس لکھ بھیجا کہ کیمرا اور دوسرے ضروری سامان میرے پاس بھیج دیجئے اور مشق شروع کر دی۔ گھر سے چلتے کہ مدرسے جا رہا ہوں اور بیچ میں ایک پارسی فوٹو گرافر کی دُکان پر بیٹھتے۔ تین چار مہینے کی محنت اور کوشش میں اس فن سے پوری واقفیت ہو گئی۔ مگر ابھی تک گھر پر کسی کو یہ راز معلوم نہ تھا۔ کئی بار برجن نے پوچھا بھی کہ آجکل دن

پھر کہاں غائب رہتے ہو تعطیل کے دن بھی نہیں نظر آتے ہو مگر کملا چرن نے ہوں ہاں کر کے ٹال دیا۔

ایک روز کملا چرن کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ برجن کے جی میں آئی للّو پرتاپ چند کو ایک خط لکھ ڈالوں مگر صندوق کھولا تو چٹھی کا کاغذ ندارد۔ مادھوی سے کہا جا کر اپنے بھیّا کے ڈسک میں سے تھوڑا سا کاغذ نکال لا۔ مادھوی دوڑی ہوئی گئی تو اُسے ڈسک پر تصویروں کا البم کھُلا ہوا ملا۔ اس نے البم اٹھا لیا اور اندر آ کر برجن سے بولی۔ "بہن دیکھو یہ تصویر ملی"۔

برجن نے اُسے شوق سے ہاتھ میں لے لیا اور پہلا ہی ورق اُلٹا تھا کہ اچنبھا سا ہو گیا۔ وہ اسی کی تصویر تھی۔ وہ اپنی پلنگ پر چادر اوڑھے نیند میں مست پڑی تھی۔ بال پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے اور ایک ایک عضو سے بے تکلفی ٹپکتی تھی ہونٹوں پر ایک شگفتہ سی مسکراہٹ کا جلوہ تھا۔ گویا کوئی دلپسند خواب دیکھ رہی ہے۔ تصویر کے نیچے جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا۔ "خواب ناز"۔ برجن حیرت میں تھی کہ میری ایسی تصویر انہوں نے کیسے کھنچوائی۔ اور کس سے کھنچوائی۔ کیا کسی فوٹو گرافر کو اندر لائے ہوں گے نہیں ایسی شرارت بھلا کیا کریں گے۔ کیا تعجب ہے خود ہی سیکھ لیا ہو۔ ادھر مہینوں سے بہت مشغول بھی تو ہیں۔ اگر خود ایسی عمدہ تصویر کھینچی ہے تو واقعی قابلِ تعریف کام کیا ہے دوسرا ورق اُلٹا تو وہ بھی اپنی ہی تصویر۔ وہ ایک ساڑی پہنے بے تکلفی سے آدھے سر تک آنچل ڈالے سیرِ چمن میں مصروف تھی۔ اس تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا "سیرِ باغ"۔ تیسرا ورق اُلٹا تو وہ بھی اپنی ہی تصویر تھی۔ وہ باغیچہ میں زمین پر بیٹھی ہار گوندھ رہی ہے ڈھیروں پھول ادھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں اور مادھوی دوڑ دوڑ پھول چن رہی ہے

یہ تصویر تینوں سے زیادہ خوبصورت تھی کیونکہ مصور نے اس میں بڑی صفائی سے قدرتی رنگ بھرے تھے۔ اس تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا:۔ "البیلی مالن"۔ اب برجن کو خیال آیا کہ ایک روز جب میں ہار گوندھ رہی تھی تو کملا چرن بیل کاٹنے کی جھاڑی سے مسکراتے ہوئے نکلے تھے۔ ضرور اسی دن یہ تصویر کھینچی ہوگی۔ چوتھا ورق اُلٹا تو ایک نہایت لطیف اور دلکش منظر دکھائی دیا۔ ایک شفاف پانی کا چشمہ تھا اور اُس کے دونوں کناروں پر جہاں تک نگاہ پہنچتی تھی۔ گلاب کے تختے نظر آتے تھے۔ ان کے نازک پھول ہوا کے جھونکوں سے لچکے جاتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا قدرت نے سبز آسمان میں سرخ تارے ٹانک دئے ہیں۔ یہ کسی انگریزی تصویر کی نقل معلوم ہوتی تھی۔ البم کے اور صفحے ابھی سادہ تھے۔

برجن نے اپنی تصویریں دوبارہ دیکھیں اور اس نخوت آمیز مسرت کے ساتھ جو ہر پری پیکر کو اپنے حسن پر ہوتی ہے البم کو چھپا کر رکھ دیا۔ شام کو کملا چرن نے آکر دیکھا تو تصویریں غائب تھیں۔ ہوش اُڑ گئے۔ نہ اس کے کئی مہینوں کی جگر کاوی کا ثمرہ تھیں اور اسے اُمید تھی کہ البم تحفہ میں دیکر برجن کے دیدہ دل میں اور بھی گھر کر لونگا۔ بہت پریشان ہوا۔ اندر جاکر برجن سے دریافت کیا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ بیچارہ گھبرایا ہوا اپنے دوستوں کے گھر گیا کہ شاید اُنمیں سے کوئی اُٹھا لے گیا ہو۔ مگر وہاں بھی بجز پھبتیوں کے اور کچھ ہاتھ نہ لگا۔ آخر جب حضرت بہت بیچ ہوگئے تو شام کے وقت برجن نے البم کا پتہ بتلایا۔

اسی طرح دن لُطف سے گزر رہے تھے۔ آپسمیں چھیڑ چھاڑ اور مزے مزے کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ دونوں کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ میدانِ اُلفت میں آگے

نکل جاؤں مگر دونوں کی محبتوں میں فرق تھا۔ کملا جہاں غلبۂ محبت میں اپنے کو بالکل بھول گیا تھا۔ برعکس اس کے برجن کی محبت فرض کی بنیاد پر قائم تھی۔ ہاں یہ خوشگوار فرض تھا جسے محبت کی چاشنی نے بہت پُر لذت بنا دیا تھا۔

تین سال اور گزر گئے۔ یہ انکی زندگی کے تین مبارک سال تھے۔ چوتھے سال کا آغاز ایام مصیبت کی ابتدا تھی۔ بعض ہستیوں کو قدرت کی جانب سے دُنیا کی نعمتیں اور کامرانیاں اس بہتات سے ملتی ہیں کہ اُن کے لئے دن سدا ہولی اور رات سدا دیوالی رہتی ہے۔ مگر کتنی ہی ایسی بدقسمت ہستیاں بھی ہیں جن کا پیمانۂ مسرت چھوٹا اور چھچھلا ہوتا ہے ایسا چھوٹا کہ آنکھ دل میں لغزش کی سُرخی آنے سے پہلے ہی جام خالی ہو جاتا ہے اور مسرت کے چند لمحے زندگی کی سیاہ گھٹا میں ایکبار بجلی کی طرح کوند کر ہمیشہ کے لئے الوداع کہہ جاتے ہیں۔ برج رانی انہیں بدقسمتوں میں تھی۔

بسنت کی رُت تھی۔ سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ سردی اس غضب کی پڑتی تھی کہ کنوؤں کا پانی جم جاتا تھا۔ اسوقت شہر میں طاعون کا سے ہوا ہزاروں آدمی اسکی نذر ہونے لگے۔ ایک روز شدت کا بخار آیا۔ ایک گلٹی نکلی اور مریض راہئی عدم ہو گیا۔ گلٹی کا نکلنا گویا موت کا پروانہ تھا۔ کیا حکیم کیا ڈاکٹر کسی کا علاج کارگر نہیں ہوتا تھا۔ سینکڑوں گھر بے چراغ ہو گئے۔ ہزاروں بچے یتیم اور ہزاروں عورتیں بیوہ ہو گئیں جسکے جدھر سینگ سمائے ادھر بھاگ نکلا۔ ہر شخص کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔ کوئی کسی کا ہمدرد اور غمخوار نہ تھا۔ والدین بچوں کو چھوڑ بھاگے عورتیں مردوں سے کنارہ کش ہو گئیں۔ گلیوں میں۔ سڑکوں پر مکانوں میں جدھر دیکھئے لاشوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ دوکانیں بند ہو گئیں۔ دروازوں

میں قفل پڑ گئے۔ چوطرفہ خاک اڑتی تھی۔ مشکل سے کوئی جاندار چلتا پھرتا دکھائی دیتا تھا اور اگر کوئی ضرورت سے مجبور ہو کر گھر سے نکل پڑا تو وہ ایسی تیزی سے قدم اٹھاتا تھا گویا موت کا سپاہی اس کے تعاقب میں ہے۔ ساری بستی ویران ہو گئی۔ اگر آباد تھا تو قبرستان یا شمشان۔ چوروں اور رہزنوں کی بن آئی۔ دن دہاڑے قفل ٹوٹتے تھے اور آفتاب کی روشنی میں سیندھیں پڑتی تھیں۔ جو لوگ طاعون سے بچے انہیں فاقوں نے آ دبوچا۔ غرض عجیب مصیبت کا سامنا تھا۔

بابو شیاما چرن بہت مضبوط دل کے آدمی تھے۔ مکان کے چاروں طرف کے محلے خالی ہو گئے تھے مگر وہ ابھی تک اپنے مکان میں بے خوف و خطر آباد تھے مگر جب ان کا ایک سائیس مر گیا تو سارے کنبہ میں کھلبلی مچ گئی۔ اور دیہات چلنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ منشی جی نے اسی ضلع میں چند گاؤں خرید لئے تھے اور مجگاؤں نامی ایک موضع میں ایک وسیع مکان بنا رکھا تھا۔ ان کا ارادہ تھا کہ پنشن پانے پر یہیں بود و باش اختیار کروں گا۔ کاشی چھوڑ کر آگرہ میں کون مر جائے برجن نے یہ تجویز سنی تو بہت خوش ہوئی۔ دیہاتی زندگی کے روشن پہلو اس کی آنکھوں میں پھر رہے تھے ہرے بھرے درخت اور سرسبز لہلہاتے ہوئے کھیت ہرنوں کے جھنڈ اور چڑیوں کا چہچہانا یہ بہاریں لوٹنے کے لئے اس کا دل بے قرار ہو رہا تھا۔ کملا چرن بھی شکار کھیلنے کے لئے بندوق صاف کرنے لگے مگر ناگاہ منشی جی نے اسے بلا کر کہا کہ تم الہ آباد چلنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ پرتاپ چند وہاں تمہارا نگراں رہیگا۔ دیہات میں اوقات ضائع کرنے سے کیا حاصل۔ اتنا سننا تھا کہ کملا چرن کی نانی مر گئی۔ الہ آباد جانے سے صاف صاف انکار کر بیٹھا۔ بہت دیر تک منشی جی کے

سمجھاتے رہے۔ مگر وہ جانے کے لئے تیار نہ ہوا۔ آخر ان کے ان آخری الفاظ نے فیصلہ کر دیا۔ "تمہارے مقسوم میں علم لکھا ہی نہیں ہے۔ میری حماقت ہے کہ اس سے لڑتا ہوں"

برج رانی نے جب یہ تازہ تجویز سنی تو اسے بھی بہت رنج ہوا۔ عورت کے مزاج میں خود بینی کا مادہ بہت ہوتا ہے۔ لیلا زعفران کے دل میں بھی اپنی خوبصورتی کی تعریف سُن کر گدگدی پیدا ہونے لگتی ہے۔ برج رانی اب بھی سمجھتی تھی کہ کملا کا دھیان پڑھنے میں نہیں لگتا مگر یہ تغافل اسے ناگوار نہ معلوم ہوتا بلکہ بعض اوقات اس کا جی چاہتا تھا کہ آج یہ مدرسے نہ جاتے تو اچھا ہوتا۔ کملا کی محبت آمیز آواز اس کے کانوں کو بہت پیاری معلوم ہوتی مگر جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ کملا نے الہ آباد جانے سے صاف انکار کیا اور لالہ جی بہت سمجھا رہے ہیں تو اُسے کچھ دنوں تک تنہا رہنا گوارا تھا۔ بجائے اس کے کہ کملا کو اپنے والد کی نافرمانی کرتے دیکھے۔ مادھوی کو بھیجا کہ اپنے بھیا کو بلا لا۔ مگر کملا نے جگہ سے ہلنے کی قسم کھالی تھی۔ سوچا کہ اندر جاؤنگا تو وہ ضرور الہ آباد جانے کے لئے زور دیگی۔ اُسے کیا خبر کہ یہاں دل پر کیا بیت رہی ہے۔ کاش اس کا دل مجھے مل جاتا۔ یوں بات چیت میں تو قند و شکر گھول دیتی ہے مگر جب کبھی محبت کے امتحان کا موقع آتا ہے تو فرض اور مصلحت کے پردہ میں منہ چھپانے لگتی ہے۔ حق یہ ہے کہ عورتوں میں وفا کی بو ہی نہیں ہوتی۔

جب رات زیادہ گزر گئی اور کملا جگہ سے نہ ہلا تو برج رانی خود آئی اور بولی:۔ "کیا آج گھر میں جانے کی قسم کھالی ہے۔ راستہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں

پتھرا گئیں"۔

کملا - اندر جاتے ڈر معلوم ہوتا ہے۔

برجن - اچھا چلو میں ساتھ ساتھ چلتی ہوں - اب تو نہ ڈروگے ؟

کملا - مجھے الہ آباد جانے کے لئے حکم ہوا ہے ۔

برجن - میں بھی تمہارے ساتھ چلونگی ۔

یہ کہہ کر برجن نے کملا کی طرف آنکھیں اُٹھائیں ۔ اُن میں انگور کے خوشے لگے ہوئے تھے ۔ کملا ہار گیا ۔ ان موہنی آنکھوں میں آنسو دیکھکر کس کا جگر تھا جو اپنی ضد پر قایم رہے ۔ کملا نے اسے گلے لگا لیا اور بولے :۔ "میں جانتا تھا کہ تم جیت جاؤگی ۔ اسی لئے اندر نہ جاتا تھا"

ساری رات محبت کی الوداعی باتیں ہوتی رہیں ۔ بار بار محبت کی نگاہیں ہم آغوش ہوتیں گویا نہ پھر کبھی نہ ملیں گی ۔ افسوس ! یہ جُدائی آخری ملاقات تھی برجن نے پھر کملا کی صورت نہ دیکھی ۔ وہ کیا جانتی تھی کہ قسمت ہمیں ہمیشہ کے لئے جُدا کر رہی ہے ۔

برجن کے خطوط کملا کے نام

(۱)

پیارے محبت نامہ آیا۔ سر اور آنکھوں سے لگایا۔ ایسے خط تم نہ لکھا کرو۔ کلیجہ
پاش پاش ہو جاتا ہے۔ میں لکھوں تو مضائقہ نہیں۔ یہاں طبیعت سخت گھبرا رہی ہے۔ کیا
سُنتی تھی اور کیا دیکھتی ہوں۔ ٹوٹے پھوٹے پھوس کے جھونپڑے، ایک ایک بالشت کی
بوسیدہ دیواریں، گھروں کے سامنے کوڑے کرکٹ کے بڑے بڑے ڈھیر، کیچڑ میں لپٹی ہوئی
سُوریں، دبلی پتلی مریل گائیں۔ یہ سب نظارہ دیکھ کر جی چاہتا ہے کہیں چلی جاؤں۔ آدمیوں
کو دیکھو تو خستہ حال۔ ہڈیاں نکلی ہوئیں۔ پریشانی کی مورت۔ افلاس کی زندہ تصویر۔ کسی
بدن پر ثابت کپڑا نہیں۔ کیسے قسمت کے کھوٹے کہ رات دن پسینہ بہانے پر بھی کبھی بھر پیٹ
روٹیاں نصیب ہوں۔ خیر ہمارے مکان کے پچھواڑے ایک چھوٹی سی گڑھیا ہے۔ مادھوری
کھیلتی تھی، پیر پھسلا تو پانی میں گر پڑی۔ یہاں مشہور ہے کہ اس گڑھیا میں چڑیلیں
نہانے آیا کرتی ہیں اور خواہ مخواہ راہ چلتوں کو چھیڑتی ہیں۔ اسی طرح دروازہ پر ایک
پیپل کا تناور درخت ہے۔ وہ بھوتوں کا بسیرا ہے۔ پیپل کے بھوتوں اور گڑھیا کی چڑیلوں
میں بہت راہ و رسم ہے۔ گڑھیا کا تو خیر بہت خوف نہیں۔ مگر ان بدبخت پیپل
کے بھوتوں کا خوف سارے گاؤں کے دلوں پر ایسا چھایا ہوا ہے کہ سر شام ہی
راستہ بند ہو جاتا ہے۔ لڑکے اور عورتیں تو ادھر قدم ہی نہیں رکھتیں

ہاں اِکّا دُکّا آدمی کبھی کبھی گزر جاتا ہے۔ مگر وہ بھی گھبرایا ہوا۔ یہ دو مقام تو گویا ان پلید روحوں کے مرکز ہیں۔ ان کے علاوہ صدہا بھوت چڑیل مختلف مقامات میں آباد پائے جاتے ہیں۔ معتبر روایتیں ہیں کہ چڑیلیں نظر آتی ہیں۔ گاؤں والوں نے ان کے مزاج کی پہچان رکھی ہیں۔ کسی بھوت کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ سر چڑھتا ہے تو مہینوں تک پیچھا نہیں چھوڑتا اور کوئی دو ایک دن میں پوجا لیکر الگ ہو جاتا ہے۔ گاؤں والوں میں ان امور پر اس طرح باتیں ہوتی ہیں گویا یہ بدیہی واقعات ہیں یہانتک سُنا گیا ہے کہ چڑیلیں کھانا مانگنے اور پانی لینے آیا کرتی ہیں۔ اُنکی ساڑیاں عموماً بگلے کے پر کی طرح صاف ستھری ہوتی ہیں۔ اور باتیں کسی قدر ناک میں کرتی ہیں۔ ہاں گہنے کا استعمال اُنکی قوم میں رائج نہیں۔ اُن کی زد میں آجانیکا خطرہ اُن جوان عورتوں کو ہوتا ہے جو بناؤ سنگار کئے۔ رنگین کپڑے پہنے اکیلی نظر آجائیں۔ پھولوں کی باس انکو بہت پسند ہے۔ مجال نہیں کہ کوئی عورت یا لڑکا دوپہر کو یا رات کو اپنے پاس پھول رکھکر سوئے!

بھوتوں کے رتبہ اور اعزاز کا امتیاز دانائی سے کیا گیا ہے۔ جوگی بابا آدھی رات کالی کمریا اوڑھے کھڑاؤں پر سوار گاؤں کے چاروں طرف گھومتے ہیں اور بھولے بھٹکے مسافروں کو راستہ بتاتے ہیں۔ سال بھر میں ایک بار اُنکی پوجا ہوتی ہے وہ اب بجائے بھوتوں کے دیوتاؤں کے زمرہ میں شمار کئے جاتے ہیں۔ وہ کسی آفت کو حتی الوسع گاؤں کے اندر قدم نہیں رکھنے دیتے۔ اس کے برعکس دھوبی بابا سے بچہ بچہ تھرتھراتا ہے جس درخت پر اُنکی بود و باش ہے اُدھر سے اگر کوئی چراغ جلنے کے بعد نکل جائے تو اس کے جان کی خیر نہیں۔ اُنہیں بھگانے کے لئے دو بوتل شراب کافی ہے

اُن کا پوجاری منگل کے دن اس درخت کے تلے گانجہ اور چرس رکھ آتا ہے۔ ایک لالہ صاحب
بھی بھوت بن بیٹھے ہیں۔ یہ وفات شریف پٹواری تھے۔ انہیں چند ستم زدہ اسامیوں نے
قتل کر ڈالا تھا۔ انکی بیوہ بلا کی پکڑ ہے کہ بلا جان لیئے پیچھا نہیں چھوڑتی۔ کوئی پٹواری
یہاں سال بھر سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم کہو گے کہ یہ کہاں سے بھوت چڑیل
کا پچڑا لے بیٹھی۔ میں کیا کروں۔ گاؤں سے ذرا فاصلہ پر ایک درخت ہے اُس پر مولوی
صاحب قیام فرماتے ہیں۔ وہ بیچارے کسی کو نہیں چھیڑتے۔ ہاں جمعرات کے روز جمعراتی
نہ پہنچ جائے تو بچوں کو ستاتے ہیں۔

کیسی جہالت ہے! کیسی وہم پرستی! یہ خیالات ان لوگوں کے خمیر ہو گئے ہیں
بچہ بیمار ہوا اور بھوت کی پوجا ہونے لگی۔ کھیت کھلیان میں بھوت کا حصہ۔ شادی
بیاہ میں بھوت کا حصہ۔ جہاں دیکھئے بھوت ہی بھوت نظر آتے ہیں۔ یہاں نہ دیوی ہیں
نہ دیوتا۔ بھوتوں کا راج ہے۔ جمراج یہاں قدم نہیں رکھ سکتے۔ دوا میں بھوت ہی
قبض کرتے ہیں۔ ان خیالات کی کیونکر اصلاح ہو گی اور کیا لکھوں۔

تمہاری برجن

(۲)

مجگاؤں

پیارے، شکر ہے بعد مدت کے تمہارا پریم پتر ملا۔ کیا سچ مچ خط لکھنے کی
بھی فرصت نہیں۔ خط کیا لکھا ہے گویا بیگار ٹالی ہے۔ تم میں تو یہ عادت نہ تھی۔
کیا وہاں جا کر کچھ اور ہو گئے۔ تمہیں یہاں سے گئے دو ماہ سے زیادہ ہوتے ہیں۔ اس
درمیان میں کئی چھوٹی بڑی تعطیلیں پڑیں مگر تم نہ آئے۔ تم سے [illegible] کر کہتی

بہن ہولی کی تعطیل میں ضرور آنا۔ اگر ابکی ترسایا تو مجھے ہمیشہ شکایت رہیگی۔
یہاں آکر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی دوسری دنیا میں آ گئی ہوں۔ رات کو
سوئی تھی کہ یکایک ہاہا ہو ہو کا غل سنائی دیا۔ چونک کر اُٹھ بیٹھی۔ دریافت کیا تو معلوم
ہوا کہ لڑکے گھر گھر سے لکڑی اور اُپلے وصول کرتے پھرتے ہیں۔ ہولی ماتا کی یہی خوراک
ہے یہ طوفان بدتمیزی جہاں پہنچ گیا ایندھن کا "صفایا" ہو گیا۔ کسی کی مجال نہیں ہے جو اس
فوج کو روک سکے۔ ایک نمبردار کی منڈیا غائب ہو گئی۔ اس میں دس بارہ بیل آسانی سے بندھ
جاتے تھے۔ ہولی والے کئی دن سے تاک میں تھے۔ موقع پاکر اُڑا لیگئے۔ ایک کرمی کا جھونپڑا
اُڑ گیا۔ کتنے ہی اُپلے لاپتہ ہو گئے۔ لوگ اپنی لکڑیاں گھروں میں بھرے لیتے ہیں۔ لالہ جی
نے ایک پیڑ ایندھن کے لئے مول لیا تھا۔ آج رات کو وہ بھی ہولی ماتا کے منہ میں چلا گیا
دو تین گھروں کے کواڑ اُتر گئے۔ پٹواری صاحب دروازہ پر سو رہے تھے۔ انہیں نیند میں بیدخل
کر کے لوگ چارپائی لے بھاگے۔ چوطرفہ ایندھن کی لوٹ مچی ہوئی ہے۔ جو چیز ایک بار ہولی
ماتا کے منہ میں چلی گئی اُسے پھیرلانا بڑا بھاری گناہ ہے۔ پٹواری صاحب نے بڑی
دھمکیاں دیں۔ میں جمعبندی بگاڑ دونگا۔ خسرہ غلط لکھ دونگا مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ یہاں کا
قانون رسمی ہے کہ ان دنوں ہولی والے جو چیز پا جائیں بلا مزاحمت لیجائیں۔ کون کس کی فریاد
کرے۔ نوجوان بیٹا اپنے باپ کی آنکھ بچا کر اپنی ہی چیز اُٹھوا دیتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ
کرے تو اپنی جماعت میں ذلیل سمجھا جاتا ہے۔

فصل تیار ہو گئی ہے مگر کاٹنے میں دو ہفتہ کی کسر ہے۔ میرے دروازہ پر سے
میلوں کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ گیہوں اور جو کے سنہرے کھیتوں کے کنارے کسم کے سرخ
اور زعفرانی پھولوں کا حاشیہ نہایت خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ چوطرفہ طوطے منڈلایا کرتے

ہیں۔ مادھوی نے یہاں کئی سکھیاں بنا رکھی ہیں۔ پڑوس میں ایک اہیر رہتا ہے رادھا نام ہے پارسال ماں باپ طاعون کا شکار ہو گئے۔ گرہستی کے کل کا بار اُسی کے سر پر ہیں۔ اُسکی بیوی تلسا ہمارے یہاں اکثر آتی ہے۔ خوبصورت ناک سک سے درست ہے۔ بات چیت کرنے میں شرمائی جاتی ہے۔ بھولی اتنی کہ جی چاہتا ہے گھنٹوں اُس کی باتیں سُنا کروں۔ مادھوی نے اُس سے بہناپا کر رکھا ہے۔ کل اُن کی گڑیوں کا بیاہ ہے۔ تلسی کی گڑیا ہے اور مادھوی کا گڈا۔ سُنتی ہوں بیچاری بہت غریب ہے مگر میں نے اُسکے چہرے پر کبھی مَیل نہیں دیکھی۔ کہتی تھی کہ اُپلے بیچ کر دو روپیہ جمع کر لیا ہے ایک روپیہ جہیز دونگی اور ایک روپیہ میں براتیوں کا کھانا پینا ہوگا۔ گڑیا کے گہنے کپڑے کا بوجھ رادھا کے سر ہے کیسی سادہ قناعت سے بھری ہوئی معاشرت ہے

لو اب رخصت ہوتی ہوں۔ تمہارا وقت بکواس سننے میں ضائع ہوا۔ معاف کرنا۔ تمہیں خط لکھنے بیٹھتی ہوں تو قلم رکتا ہی نہیں۔ ابھی بہتیری باتیں لکھنے کو پڑی ہیں۔ پرتاپ چند سے میرا پالاگن کہدینا۔

تمہاری برجن

(۳)

مجگاؤں

پیارے تمہارا محبت نامہ ملا سینہ سے لگایا۔ خوب! چوری اور سینہ زوری اپنے نہ آنے کا الزام میرے سر رکھتے ہو۔ میرے دل سے کوئی پوچھے کہ اسے تمہارے دیدار کی کتنی آرزو ہے۔ اب یہ تمنا روز بروز اضطراب کی صورت پکڑتی جاتی ہے کبھی کبھی بیچین ہو جاتی ہوں۔ میری یہ حالت تھوڑے ہی دنوں سے ہونے لگی ہے

جسوقت یہاں سے گئے ہو مجھے معلوم نہ تھا کہ وہاں جاکر میری دلیل کروگے خیر تمہیں سچ
اور میں ہی جھوٹ ۔ مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم نے میرے دونوں خط پسند کئے۔ مگر پرتاپ
چند کو ناحق دکھلائے وہ حالات بالکل قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ غلطیاں
رہ گئیں ہوں مجھے یقین نہیں آتا کہ پرتاپ نے انہیں بہت قیمتی سمجھا۔ اگر وہ میرے خطوط
کی اتنی وقعت سمجھتے ہیں کہ ان کے سہارے سے ہماری دیہاتی معاشرت پر کوئی دلچسپ
مضمون لکھ سکیں تو میں اپنے تئیں بہت خوش قسمت سمجھتی ہوں۔

کل یہاں دیوی جی کی پوجا تھی ہل چکی۔ پر۔ چولھے سب بند تھے۔ دیوی جی کا
ایسا ہی حکم ہے۔ ان کے حکم کی نافرمانی کون کرے حقہ پانی بند ہو جائے۔ سال بھر میں
یہی ایک دن ہے جسے گاؤں والے بھی تعطیل سمجھتے ہیں ورنہ ہل بیل بھی روزمرہ کے
ضروری کام نہیں بند کر سکتیں۔ بکرا چڑھا۔ ہون ہوا۔ ستو کھلایا گیا۔ اب گاؤں کے
بچے بچے کو یقین کامل ہے کہ طاعون کا دورہ یہاں نہ ہو سکے گا۔ یہ سب تماشہ دیکھ کر سوئی
تھی۔ قریب بارہ بجے ہونگے کہ سیکڑوں آدمی ہاتھوں میں مشعلیں لئے غل مچاتے نکلے
اور سارے گاؤں کا پھیرا کیا جس کے معنی یہ ہیں کہ بیماری اس حد کے اندر قائم نہ رہ
سکیگی۔ طواف کے ختم ہونے پر چند آدمی دوسرے گاؤں کی حدود میں گھس گئے اور
تھوڑا سا پان چاول لونگ وغیرہ چیزیں زمین پر رکھدیں یعنی اپنے گاؤں کی بلا دوسرے
گاؤں میں ٹالدی جب یہ لوگ اپنا کام پورا کر کے چلنے لگے تو اس گاؤں والوں کو سن
گن مل گئی بیسیوں آدمی لاٹھی لیکر چڑھ دوڑے اور دونوں فریق میں خوب مار پیٹ
ہوئی۔ اسوقت گاؤں کے کئی آدمی ہلدی پی رہے ہیں۔

آج سویرے کل کے بچے کھچے رسوم ادا کئے گئے جسے یہاں کی اصطلاح میں کڑھائی

دیتا کہتے ہیں۔ میرے دروازہ پر ایک بھٹہ کھودا گیا اور اس پر ایک کڑاہ دودھ سے لبریز رکھا گیا کاشی نام کا ایک بھر ہے میدان میں بھبھوت رمائے آیا۔ گاؤں کے آدمی ٹاٹ پر بیٹھے سنکھ بجنے لگا۔ کڑاہ کے چاروں طرف مالا پھول بکھیر دیا گیا۔ جب کڑاہ میں خوب اُبال آیا تو کاشی یکایک اٹھا اور جے کالی جی کی! کہکر کڑاہ میں کود پڑا۔ میں سمجھی اب یہ زندہ نہ نکلیگا مگر پانچ منٹ کے بعد کاشی نے پھر جست ماری اور کڑاہ کے باہر تھا۔ اس کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ لوگوں نے اُسے مالا پہنائی اور ہاتھ جوڑ کر پوچھنے لگے: مہراج ابکی فصل کیسی ہوگی۔ پانی کیسا برسیگا۔ بیماری آئیگی یا نہیں۔ گاؤں کے لوگ خیریت سے رہیں گے؟ گڑ کا بھاؤ کیسا رہیگا؟ کاشی نے ان سب سوالوں کے جواب صاف صاف مگر مجذوبانہ الفاظ میں دئے۔ اس کے بعد مجلس برخاست ہوئی۔ سُنتی ہوں یہ جلسے ہر سال ہوا کرتے ہیں۔ کاشی کی پیشینگوئیاں سب سچی ثابت ہوتی ہیں اور کبھی ایک آدھ غلط بھی نکل آیئں۔ تو کاشی ان کی تاویل بڑی خوبی سے کر دیتا ہے۔ کاشی کو ضمیر شناسی میں بڑا ملکہ ہے۔ گاؤں میں کہیں چوری ہو کاشی اس کا پورا پتہ لگا دیگا۔ جو کام پولیس کے بھیدیوں سے پورا نہ ہو۔ اسے وہ پورا کر دیتا ہے۔ اور گو وہ ذات کا بھر ہے مگر گاؤں میں اس کی بڑی عزت ہے ان سب خدمات کا معاوضہ وہ بجز شراب کے اور کچھ نہیں لیتا۔ نام نکلوا ئیے مگر ایک بوتل اسکے نذر کیجیے۔ آپ کا مقدمہ کچہری میں ہے کاشی اسکی فتح کی کوشش میں سرگرم ہے۔ بس اُسے ایک بوتل آب سُرخ دیجیے۔

ہولی کا زمانہ بہت قریب ہے ایک ہفتہ سے زائد نہیں۔ اہا! میرا دل اس وقت کیسا باغ باغ ہو رہا ہے۔ دل میں مسرت آمیز گدگدی محسوس ہو رہی ہے آنکھیں

تمہیں دیکھنے کے لئے بیقرار ہو رہی ہیں۔ یہ ہفتہ بڑی مشکلوں سے کٹے گا اور تب! میں
اپنے پیا کا درشن پاؤں گی۔

تمہاری پیاری برجی

(۴۴)

مجگاؤں

پیارے! تم ظالم ہو۔ سنگدل ہو۔ بیوفا ہو۔ بیرحم ہو۔ بے درد ہو۔ جھوٹے ہو
اور میں تمہیں کیا گالیاں دوں اور کیا کوسوں۔ کاش تم اسوقت میرے سامنے ہوتے
تو اس سنگدلی کا جواب دیتی۔ میں کہہ رہی ہوں۔ تم دغا باز ہو۔ میرا کیا کر لوگے۔ نہیں
آتے ہو مت آؤ۔ اگر میری صورت سے بیزار ہو بہتر۔ اگر میری جان لینے پر آئے ہو شوق
سے لیلو۔ رُلانا منظور ہے رُلاؤ مگر میں روؤں کیوں۔ میری بلا روئے۔ جب آپکو اتنا
خیال نہیں کہ دو گھنٹہ کا سفر ہے ذرا اسکی خبر لیتا آؤں تو مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ
روؤں اور جان کھودوں۔

ایسا غصہ آرہا ہے کہ خط چاک کرکے پھینکدوں اور تم سے پھر بات نہ کروں
ہائے! تم نے میرے ارمان کیسے خاک میں ملا دئے ہیں۔ ہولی! ہولی! اس ایک لفظ
میں میرے لئے جادو کا اثر تھا۔ کسی کے زبان سے نکلا اور میرے دل نے گدگدانا
شروع کردیا۔ مگر افسوس! ہولی گذر گئی۔ اور میں ناکام اور نامراد رہ گئی۔ پہلے یہ لفظ سنکر
دل میں گدگدی ہوتی تھی ـــ اب کلیجہ مسوستا ہے۔ اپنی اپنی قسمت ہے گاؤں کے
بھوکے ننگے لنگوٹی میں پھاگ کھیلیں۔ خوشیاں منائیں۔ رنگ اُڑائیں اور میں
بیوگنی اپنی چارپائی پر سفید ساڑی پہنے پڑی ہوں۔ قسم لیلو جو اُس پر ایک سُرخ دھبہ بھی

پڑا ہو تبسم لیلوچ میں نے عبیر یا گلال ہاتھ سے چھوا ہو۔ میری عطر میں بسی ہوئی عبیر
کیوڑے میں گھولی ہوئی گلال۔ تکلف سے بنائے ہوئے پان سب تمہاری بے مہری کا رونا رو
رہے ہیں۔ یاد ہوگی لے جب بہت ہٹ کی تو میں نے ایک سرخ ٹیکہ لگوا لیا مگر آج
سے ان شکایتوں کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اگر پھر کوئی کلمہ شکایت زبان سے نکلے تو زبان کاٹ لینا

پرسوں سرشام ہی سے گاؤں میں چہل پہل مچنے لگی۔ نوجوانوں کی ایک جماعت
ہاتھ میں ڈف لیے کالی مغلظات بکتی دروازے دروازے پھیرے لگانے لگی۔ مجھے
معلوم تھا کہ آج یہاں اتنی گالیاں کھانی پڑیں گی۔ شرمناک الفاظ ان کے منہ سے ایسے
بے تکلف نکلتے ہیں جیسے پھول جھڑتے ہوں۔ شرم و لحاظ کا نام نہ تھا۔ باپ بیٹے کے منہ
پر، بیٹا باپ کے سامنے گالیاں بک رہا ہے۔ باپ للکار کر بہو سے کہتا ہے "آج ہولی
ہے"۔ بہو گھر میں سر نیچا کیے سنتی ہے اور مسکرا دیتی ہے۔ ہمارے پٹواری صاحب تو
ایک ہی حضرت نکلے۔ آپ شراب میں مخمور نشہ میں چور ایک میلی سی ٹوپی سر پر رکھے اس جماعت کے
پیشرو تھے۔ انکی بہو بیٹیاں بھی ان کے مغلظات کی طغیانی سے بچ نہ سکیں۔ گالیاں کھاؤ
اور ہنسو اگر چہرے پر ذرا بھی ملال آئے تو لوگ سمجھیں کہ محرم کی پیدائش ہے۔ خوب تماشا ہے!

تین بجے شب کے قریب یہ جماعت ہولی ماتا کے پاس پہنچی۔ لڑکے آتشبازیاں چھوڑ
رہے ہیں۔ میں بھی کئی عورتوں کے ساتھ گئی۔ وہاں عورتیں ایک طرف ہولیاں گا رہی تھیں
آخر ہولی میں آگ لگانے کا وقت آیا۔ آگ لگتے ہی دم کی دم میں شعلے بلند ہوئے
اور سارا آسمان سنہرے رنگ میں رنگ گیا۔ دور دور تک کے پیڑ پتے منور ہو گئے۔ اب
اس آتشکدہ کے چاروں طرف لوگ ہولی ماتا کی جے چلا چلا کر دوڑنے لگے۔ سب کے
ہاتھوں میں گیہوں اور جو کی بالیاں تھیں جو وہ اس آگ میں پھینکتے جاتے تھے۔ جب شعلے

بہت بلند ہو گئے تو لوگ ایک کنارے کھڑے ہو کر پھر کبیر کہنے لگے ۔ دو گھنٹہ تک یہی کیفیت رہی لکڑی کے کندوں سے چٹاخ پٹاخ کی آوازیں نکل رہی تھیں ۔ مویشی اپنے اپنے کھونٹوں پر مارے ڈر کے چیخ رہے تھے تکسا نے مجھ سے کہا ۔ ابکی ہولی کی لو ٹیڑھی جا رہی ہے کشل نہیں ۔ جب لو سیدھی اُٹھتی ہے تو گاؤں میں سال بھر خوشی کا دور رہتا ہے لیکن لو کا ٹیڑھا ہو جانا منحوس ہے ۔ آخر شعلے تھمنے لگے ۔ آنچ کی تیزی کم ہوئی ۔ تب کچھ لوگ الاؤ کے نزدیک آ کر غور سے دیکھنے لگے جیسے کوئی چیز تلاش کر رہے ہوں ۔ تکسا نے تبلایا کہ جب بسنت کے دن ہولی کی نیاد پڑتی ہے تو پہلے ایک ارنڈ گاڑ دیتے ہیں اُس پر لکڑی اور اُپلے کا ڈھیر لگایا جاتا ہے اس وقت یہ لوگ اُسی رنڈ کے پودے کی تلاش کر رہے تھے ۔ اُس شخص کا بہادروں میں شمار ہوتا ہے جو سب سے پہلے اس پودے پر ایسا نشانہ لگائے کہ وہ ٹوٹ کر دور جا گرے ۔ پہلے پٹواری صاحب پینترا بدلنے آئے مگر دس گز کی دوری سے جھانک کر لوٹ گئے ۔ تب رادھا ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سونٹا لئے دلیرانہ مستقل مزاجی سے آگے بڑھا اور آگ میں گھُس کر وہ بھرپور ہاتھ لگایا کہ پودا الگ جا گرا لوگ اُن ٹکڑوں کو لوٹنے لگے ۔ ماتھے پر اُس کا ٹیکا لگایا کرتے ہیں ۔ اور اُسے متبرک سمجھتے ہیں ۔

یہاں سے فرصت پا کر یہ مردانہ جماعت دیوی جی کے استھان کی طرف بڑھی مگر یہ نہ سمجھنا کہ وہاں دیوی جی کا ادب کیا گیا ہوگا ۔ آج وہ بھی گالیاں سننا پسند کرتی ہیں ۔ چھوٹے بڑے سب انہیں مغلظات سنا رہے تھے ۔ چند دن پہلے انہیں دیوی جی کی پوجا ہوئی تھی ۔ حق یہ ہے کہ دیہات میں اس وقت ایشور کو گالی دینا بھی معاف ہے ماں بہن کا تو کہیں شمار ہی نہیں ۔

سویرا ہوتے ہی لالہ جی نے مہراج سے کہا: "آج کوئی دو سیر بھنگ پسوا لو۔ اسکی دو قسمیں الگ الگ بنوا لو۔ نمکین اور شیریں۔ مہراج نکلے اور کئی آدمیوں کو پکڑ لائے۔ بھنگ پیسی جانے لگی۔ بہت سے کلھڑ منگا کر صفائی سے رکھے گئے۔ دو مٹکوں میں دونوں قسموں کی بھنگ بنائی گئی۔ پھر کیا تھا، تین چار گھنٹے تک شائقین کا تانتا لگا رہا۔ لوگ خوب تعریفیں کرتے اور سر ہلا ہلا کر مہراج کی کارگزاریوں کی داد دیتے۔ جہاں کسی نے قدر دانی کی اور مہراج نے دوسرا کلھڑ بھرا۔ اور بولے یہ نمکین ہے اس کا بھی سواد چکھ لو۔ اجی پی بھی لو۔ کیا روز روز ہولی آئیگی کہ روز روز ہمارے ہاتھ کی بنی ہوئی بوٹی ملیگی۔ اسکے جواب میں کسان ایسی نگاہوں سے تاکتا ہے گویا کسی نے اُسے نعمت دیدی۔ اور ایک کے بدلے تین گلھڑ چٹ کر جاتا ہے۔ پٹواری کے داماد منشی جگدمبا پرشاد صاحب تشریف لائے ہیں۔ آپ کچہری میں عرائض نویس ہیں۔ اُنہیں مہراج نے اس قدر پلا دی کہ آپے سے باہر ہو گئے اور ناچنے کودنے لگے۔ گاؤں کا گاؤں اُنہیں آماجگاہ ظرافت بنائے ہوئے تھا۔ ایک کسان آتا ہے اور اُنکی طرف مسکرا کر کہتا ہے "تم یہاں ٹھاڑھی ہو۔ گھر جا کے کھانا پکاؤ، ہم آوت ہیں"۔ اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑتا ہے۔ کاشی بھر دوسرا نشہ جمائے۔ لٹھ کندھے پر رکھے ہوئے آتا ہے اور حاضرین کی طرف نقلی غصے سے دیکھ کر گرجتا ہے۔ "مہراج! یہ بات اچھی نہیں ہے کہ تم ہمرے نئی بہریا سے مجا لوٹت ہو"۔ یہ کہکر وہ منشی جی کو سینہ سے چمٹا لیتا ہے۔ منشی جی بیچارے مختصر آدمی اِدھر اُدھر پھڑپھڑاتے ہیں مگر نقارے کی آواز میں طوطی کی کون سنتا ہے۔ کوئی اُن کو چومتا ہے کوئی پیار کرتا ہے۔ کوئی گلے لگاتا ہے۔ دوپہر تک یہی چھیڑ چھاڑ ہوا کی۔ اُنکی دل لگی ایسی بھدی اور غلیظ ہوتی ہے کہ کئی بار میرا جی بدمزہ ہو گیا۔ دوپہر ہو گیا لیکن

تلسا ابھی تک بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اُس سے کہا "آج ہمارے یہاں تمہارا نیوتہ ہے ہم تم ساتھ ساتھ کھائیں گی۔" یہ سُنتے ہی مہراجن دو تھالیوں میں کھانا تکلف سے پروسکر لائیں۔ تلسا اسوقت کھڑکی کیطرف منہ کئے کھڑی تھی۔ میں نے جو اُس کا ہاتھ پکڑکر اپنی طرف کھینچا تو اُسے اپنی پیاری پیاری آنکھوں سے موتی کے دانے بکھیرتے ہوئے پایا۔ گلے لگا کر بولی "سکھی سچ سچ بتلا دو کیوں رو رہی ہو۔ ہم سے کوئی پردہ مت رکھو۔" اس پر وہ اور بھی سسکنے لگی۔ جب میں بہت بضد ہوئی تو اس نے سر نیچا کرکے کہا "بہن آج سویرے سے اُن پریشان پڑگیا۔ نہیں معلوم اُن پر کیا بیت رہی ہوگی۔" یہ کہکر وہ زار و قطار رونے لگی۔ معلوم ہوا کہ رادھا کے باپ نے کچھ قرض لیا تھا وہ ابھی تک ادا نہ ہو سکا۔ مہاجن نے سمجھا اسے حوالات لے چلوں تو روپیہ وصول ہو جائے۔ رادھا کنی کاٹتا پھرتا تھا۔ آج حریفوں کو موقع مل گیا اور وہ اپنا کام کر گئے۔ افسوس! مواخذہ بیس روپیہ سے زائد نہ تھا۔ پہلے مجھے معلوم ہوتا تو غریب پر برس برس کے دن یہ مصیبت نہ آنے پاتی۔ میں نے چپکے سے مہراج کو بلایا اور انہیں بیس روپے دیکر رادھا کو رہا کرانے کے لئے روانہ کیا۔

اسوقت میرے دروازہ پر ایک ٹاٹ بچھوایا گیا تھا۔ لالہ جی بیچ میں قالین پر بیٹھے تھے۔ کسان لوگ گھٹنے تک دھوتیاں باندھے۔ کوئی کُرتہ پہنے۔ کوئی ننگے بدن۔ کوئی سر پر پگڑی باندھے۔ کوئی ننگے سر منہ پر عبیر ملے (جو اُنکی کالی صورت پر خاص کیفیت پیدا کر رہی تھی) آنے لگے۔ جو آتا لالہ جی کے پیروں پر تھوڑی سی عبیر رکھدیتا۔ لالہ جی بھی اپنی طشتری میں سے ذرا سی عبیر نکالکر اس کے ماتھے پر لگا دیتے اور مُسکرا کر کوئی دل لگی کی بات کہدیتے۔ وہ نہال ہو جاتا۔ زمین دوز ہوکر سلام کرتا اور ایسا خوش خوش آکر بیٹھ جاتا گویا اُسے کوئی دولت مل گئی ہے۔ مجھے خواب میں بھی گمان نہ تھا کہ لالہ جی

ان اُجڈ دیہاتیوں کے ساتھ بیٹھکر ایسے مزے سے باتیں کرسکتے ہیں۔ اسی اثنا میں کاشی
بھر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی پیالی تھی۔ اُس میں عبیر لئے ہوئے تھا مگر اُس نے
اوروں کی طرح عبیر لالہ جی کے پیروں پر نہیں رکھی بلکہ بڑی ڈھیری سے مٹھی بھر لیکر اُن کے
چہرے پر اچھی طرح ملدی۔ میں تو ڈری کہیں لالہ جی بدمزہ نہ ہوجائیں مگر وہ بہت خوش
ہوئے اور خود بھی بجائے ایک ٹیکہ لگانے کے دونوں ہاتھوں سے اُس کے منہ پر عبیر ملی۔
بعد ازاں مُسکرا کر کہا "آج اپنے گھر میں کہدینا ہمارے لئے بچھاون تیار رہے"۔ کاشی نے
بھی اُسی طرح مُسکرا کر کہا "سرکار ہم برس برس کے دن کہاں جائینگے"۔ اسوقت کاشی
کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔ وہ اپنی نگاہ میں اپنے تمام ساتھیوں کا راجہ معلوم ہوتا تھا
اس کے ساتھی بھی اُسکی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے کہ بیشک تو شیر ہے
اور تو اس قابل ہے کہ ہمارا سردار بنے۔ اسی طرح ایک ایک کرکے دو ڈھائی سو آدمی جمع
ہوگئے۔ یکایک انہوں نے کہا "آج کہیں رادھا نہیں نظر آتا۔ کیا بات ہے کوئی
اُس کے گھر جاکے دیکھے" تو منشی جگت پرشاد اظہار لیاقت کا اچھا موقع دیکھکر
بول اُٹھے "حضور وہ تو بعلت قرضہ زیر دفعہ ۱۳ نمبر الف ایکٹ (ج) گرفتار ہو
گیا۔ رامدین پانڈے نے وارنٹ کا خرچہ داخل کردیا تھا" حُسن اتفاق سے رامدین پانڈے
بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ لالہ نے اُنکی طرف نہایت حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھکر کہا
"کیوں پانڈے جی! اس غریب کو حوالات میں بند کرانے سے تمہارا گھر بھر جائیگا۔ یہی
انسانیت اور شرافت اب رہ گئی ہے۔ تمہیں ذرا بھی رحم نہ آیا کہ ہولی کے دن اسے بیوی
بچوں سے الگ کردیا۔ میں تو بہ ایمان کہتا ہوں کہ اگر میں رادھا ہوتا تو جیلخانہ سے واپس
آنیکے بعد میری پہلی کوشش ہوتی کہ جس نے مجھے یہ دن دکھایا ہے اُسے میں بھی کچھ دنوں

ہلدی پلوادوں۔ تمہیں شرم نہیں آتی کہ اتنے معتبر مہاجن ہو کر تم نے بیس روپے کے لئے ایک غریب آدمی کو یوں مصیبت میں ڈالا۔ ڈوب مرنا چاہیئے ایسی لالچ پر" لالہ جی کو واقعی غصہ آ گیا تھا۔ رام دین ایسا خفیف ہوا کہ سب سٹی پٹی بھول گئی۔ منہ سے بات نہ نکلی۔ چپکے سے کچہری کی طرف چلے۔ سب کے سب کسان اُسکی طرف غضبناک نگاہوں سے تاک رہے تھے۔ اگر لالہ جی کا خوف نہ ہوتا تو پانڈے جی کی ہڈی پسلی وہیں چور ہو جاتی۔

اسکے بعد لالہ جی گھر میں آئے اور اپنے کمرہ میں بیٹھکر بنت عنب سے کچھ شوق کرنے لگے۔ باہر حاضرین محفل نے گانا شروع کیا۔ نشہ میں تو سب کے سب چور ہو ہی رہے تھے۔ اس پر لالہ جی کے ان برادرانہ خاطر و مدارت نے اُنکے دلوں کو اور بھی اُبھار دیا تھا خوب ہی جی توڑ کر گایا۔ ڈفلی تو ایسی زور سے بجتی تھی کہ اب پھٹی اور اب پھٹی۔ جگدمبا پرشاد نے دوہرا نشہ چڑھایا تھا۔ کچھ تو اُن کے دل میں خود بخود اُمنگ پیدا ہوئی۔ کچھ دوسروں نے اشتعال دلایا۔ آپ بیچ مجلس میں کھڑے ہو کر ناچنے لگے۔ یقین مانو ناچنے لگے میں نے اچکن ٹوپی دھوتی اور موچھوں والے آدمی کو ناچتے نہ دیکھا تھا۔ آدھ گھنٹے تک وہ بندروں کی طرح اُچھلتے کودتے رہے۔ آخر نشہ نے اُنہیں زمین پر سُلا دیا۔ اُنکے بعد ایک اور اہیر اُٹھا ایک اہیرن بھی زنانہ جماعت سے نکلی اور دونوں میدان میں جا کر ناچنے لگے۔ دونوں نوجوان تھے اور پھرتیلے اُنکی کمر اور پشت کی لچک واقعی حیرت انگیز تھی۔ ڈف تال دے رہا تھا۔ ان کے رمزو کنائے عشوے و غمزے۔ کمر کا لچکنا اور بوٹی بوٹی کا پھڑکنا۔ گردن کا موڑ اور اعضا کا مروڑ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ بہت مشق اور محنت کا کام ہے مگر اکثر ادائیں اور کنائے بیحیائی اور بے شرمی کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ تلسا بھی ناچتی ہے۔ مگر رادھا کے سوا اور کسی کے ساتھ نہیں اور یہی چاہیئے بھی ؛

ابھی یہاں ناچ ہی ہو رہا تھا کہ سامنے بہت سے آدمی لمبی لمبی لاٹھیاں کندھوں
پر رکھے آتے دکھائی دیے ان کے ساتھ ایک ڈف بھی تھا اور کئی آدمی ہاتھوں میں جھانجھ
اور مجیرے لئے ہوئے تھے وہ گاتے بجاتے آئے اور ہمارے دروازے پر رکے
یکایک تین چار آدمیوں نے ملکر ایسی زور سے آر۔ر۔ر۔۔ کبیر کا نعرہ لگایا کہ مکان
ہل گیا۔ لالہ جی نکلے۔ یہ لوگ اسی موضع کے تھے جہاں نکاسی کے دن لاٹھیاں چلی
تھیں۔ لالہ جی کو دیکھتے ہی کئی آدمی دوڑے ان کے منہ پر عبیر ملی۔ لالہ جی نے ان کو جواب
دیا پھر لوگ فرش پر بیٹھے الائچی اور پان سے خاطر کی گئی۔ اس گاؤں والوں نے بھی
خوب ہی ملیں اور ملائیں جب یہ لوگ رخصت ہونے لگے تو یہ ہولی گائی۔

سدا آنند رہے اس دوارے موہن کھیلیں ہوری

کتنا خوبصورت گیت ہے۔ مجھے تو اس میں جذبہ اور اثر کوٹ کوٹ کر بھرا
معلوم ہوتا ہے ہولی کی غرض اور غایت کیسے سادے اور مختصر الفاظ میں بیان کر دی گئی
ہے۔ سدا آنند رہے اس دوارے موہن کھیلیں ہوری۔ میں بار بار یہ پیارا گیت گاتی ہوں
اور مزہ لیتی ہوں ہولی کا تہوار آپس میں اخلاص و پیار محبت و اتحاد بڑھانے کے لئے
ہے یہی سبب تھا کہ وہی لوگ جن سے چند روز قبل ماتھا پھٹول کی نوبت آ چکی تھی۔ اس گاؤں
میں یوں بے ہوا چلے آئے مگر یہ معلوم ہوتا ہے آج کسی کو کسی سے دشمنی نہیں ہے۔
آج امن کی بادشاہت ہے آج محبت اور مسرت کا راج ہے۔ آج خوشی کا دن ہے
آج کے دن اگر کوئی کج کرے تو پردیسی عالم کر دیا جائے تو نوجوان ہوں۔ ان کے سوا
سب کے لئے خوشی کا صلائے عام ہے کہ خوب مزے اڑاؤ خوب گلچھرے اڑاؤ
آنے جانیوالوں کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ یکایک لالہ جی کی متین آواز آئی کبیر

کہتی ہوئی سُنائی دی - مجھے حیرت ہوئی - کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو واقعی وہی کانوں پر ہاتھ دھرے آر . . . ر کی ہانک لگا رہے ہیں کبیر یہ ہے -

ہولی کے دن آئے پیارے کہ گھم گھرڈھنڈھورا دیو پھرائے -

جو نرا اب مدرا نہ پیئے وا کو ساتوں جنم لسائے -

خوب! لالہ جی کی زبان سے اور یہ ہولی! شام کے وقت گاؤں کی سب عورتیں ہمارے یہاں ہولی کھیلنے آئیں سر ایک اپنے اپنے لوٹے میں گھولی ہوئی عبیر لیے ہوئے تھی اس نے انہیں بڑی عزت سے بٹھایا - رنگ کھیلا پان تقسیم کیا - میں مارے خوف کے باہر نہ نکلی اس طرح نجات ملی - اب مجھے خیال آیا کہ ادھوی دوپہر سے غائب ہے - میں نے سوچا تھا کہ شاید گاؤں میں ہولی کھیلنے گئی ہو مگر ان عورتوں کے ساتھ تلسا نہ تھی ڈابھی تک چپ چاپ من مارے کھڑکی کی طرف منہ کیے بیٹھی تھی چراغ میں بتی پڑ رہی تھی کہ وہ یکایک اٹھی اور میرے پیروں پر گر کر رونے لگی میں نے کھڑکی کی طرف جھانکا تو دیکھتی ہوں کہ آگے آگے مہراج - اُن کے پیچھے رادھا اور سب سے پیچھے رامدین پانڈے چلے آ رہے ہیں - گاؤں کے بہت سے آدمی اُن کے ساتھ ہیں - رادھا کا چہرہ مرجھایا ہوا ہے لالہ جی نے جوں ہی سُنا کہ رادھا آگیا - جھٹ باہر نکل آئے اور بڑی محبت سے اُسے گلے لگا لیا - جیسے کوئی اپنے بیٹے کو گلے لگاتا ہے - رادھا چیخیں مار مار رونے لگا تلسا سے بھی ضبط نہ ہو سکا - ڈ زینہ سے اُتری اور لالہ جی کے پیروں پر گر پڑی - لالہ جی نے اُسے بھی بڑی محبت سے اُٹھایا - میری آنکھوں سے بھی اُس وقت ضبط نہ ہو سکا گاؤں کے بہت سے آدمی رو رہے تھے نہایت دردناک سین تھا لالہ جی کی آنکھوں میں میں نے کبھی آنسو نہیں دیکھے تھے ڈ اسوقت دیکھے رامدین پانڈے سر نیچا کئے ایسا کھڑا

تھا جیسے گئو ہتیا کی ہو۔ میرے روپے مل گئے مگر نیت ہے اُسے تلسا کے لئے ایک گائے لینے میں خرچ کروں۔

رادھا اور تلسا دونوں اپنے گھر گئے مگر ذرا دیر میں تلسا مادھوی کا ہاتھ پکڑے ہنستی ہوئی میرے کمرہ میں آئی اور بولی "ان سے پوچھو یہ اب تک کہاں تھیں"؟

میں۔ کہاں تھیں تم؟ دوپہر سے غائب ہو۔

مادھوی۔ یہیں تو تھی۔

میں۔ یہاں کہاں تھیں میں نے دوپہر سے نہیں دیکھا سچ سچ بتاؤ میں ناراض نہ ہونگی۔

مادھوی۔ تلسا کے گھر تو چلی گئی تھی۔

میں۔ تلسا تو یہاں بیٹھی ہے۔ وہاں اکیلے کیا سوتی رہیں؟

تلسا (ہنسکے) سوتی کاہیکو رہیں جاگتی رہیں کھانا پکاتی رہیں چوکا برتن کرتی رہیں۔

مادھوی۔ ہاں چوکا برتن کرتی رہیں۔ کوئی تمہارا نوکر لگا ہوا ہے۔

معلوم ہوا کہ جب سے میں نے تمہارے کو رادھا کو چھوڑ لینے کے لئے روانہ کیا تھا تب سے مادھوی تلسا کے گھر کھانا بنانے میں مصروف تھی ان کے گوارے کھولنے یہاں آ نا گھی شکر سب لیگئی آگ جلائی اور پوریاں کچوریاں۔ گلگلے۔ میٹھے سموسے سب بڑی نفاست سے بنائے۔ اُس نے سوچا تھا کہ یہ سب پکا کے چپکے سے چلی جاؤنگی۔ جب رادھا اور تلسا آئینگے تو تعجب کرینگے کہ کون بنا گیا۔ مگر غالباً دیر ہو گئی اور مجرم پکڑا گیا۔

دیکھو کیسی نیک بخت لڑکی ہے۔

اتنی سمع خراشی کے بعد رخصت ہوتی ہوں۔ گستاخیوں معاف کرنا۔ تمہاری چیری ہوں جیسے رکھو گے ویسے رہونگی۔ عبیر اور گلال بھیجتی ہوں۔ یہ تمہاری کنیز کا تحفہ ہے۔

اولا دے گرنے لگے ۔ میں نے اتنے بڑے اولے گرتے نہ دیکھے تھے ۔ آلو جتنے بڑے اور ایسی تیزی سے گرے جیسے بندوق کی گولی ۔ دم کی دم میں زمین پر ایک فٹ اونچا اولے کا سفید فرش بچھ گیا ۔ چاروں طرف سے کسان بھاگنے لگے ۔ گائیں بیل ۔ بکریاں سب چلاتی ہوئیں پیڑوں کا سایہ ڈھونڈتی پھرتی تھیں ۔ میں ڈری کہ نہیں معلوم تلسا پر کیا بیتی ۔ نظر دور کر دیکھا تو ایک کھلے میدان میں جو اناج کے کٹ جانے سے کھیت دست ہو رہا تھا ۔ تلسا ۔ رادھا اور موہنی گائے نظر آئیں ۔ تینوں گھمسان اولے کی زد میں پڑے ہوئے تھے ۔ تلسا کے سر پر ایک چھوٹی سی ٹوکری تھی اور رادھا کے سر پر ایک بڑا سا گٹھا ۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے کہ نہیں معلوم ان بیچاروں کا کیا حشر ہوگا ۔ دفعتاً ایک سخت جھونکے نے رادھا کے سر سے گٹھا گرا دیا ۔ گٹھا کا گرنا تھا کہ دم زدن میں تلسا نے اپنی ٹوکری اسکے سر پر باندھا دی ۔ نہیں معلوم اُس پھول سے جسم پر کتنے اولے پڑے ۔ اُسکے ہاتھ کبھی پیٹھ پر جاتے کبھی سر سہلاتے ۔ ایک سیکنڈ سے زیادہ یہ حالت رہی ہوگی ۔ کہ رادھا نے بجلی کی طرح جھپٹ کر گٹھا اٹھا لیا ۔ اور ٹوکری تلسا کو دے دی ۔ کیسی زبردست محبت ہے!

ظالم آسمان نے سارے سامان بگاڑ دئے ۔ سویرے عورتیں گاتے ہوئے جا رہی تھیں ۔ شام کو گھر گھر ماتم بپا تھا ۔ کتنوں کے سر لہو لہان ہو گئے ۔ کتنے ہلدی پی رہے ہیں ۔ فصل ستیاناس ہوگئی ۔ اناج برف کے تلے دب گیا ۔ بخار کا زور ہے ۔ سارا گاؤں اسپتال بنا ہوا ہے ۔ کاشی بھر کی پیشگوئی صادق آئی ۔ ہولی کے شعلوں کا راز ظاہر ہو گیا ۔ فصل کا یہ حال اور مالگذاری وصول کی جا رہی ہے ۔ بڑی بدعت ہو رہی ہے ۔ مار دھاڑ ۔ گالی گفتہ غرض سبھی ہتھیاروں سے کام لیا جا رہا ہے ۔ غریبوں پر یہ قہر خدا

تمہاری برجن

(۶)

مجگاؤں

میرے جان سے پیارے بالم۔ پورے پندرہ دن کے بعد تم نے برجو کو یاد کیا۔
خط کو بار بار پڑھا، چوما، آنکھوں سے لگایا اور ایک ایک حرف کا مزہ لیا۔ تمہارا خط ملا
رُلائے نہیں مانتا۔ میں یوں بھی بہت رویا کرتی ہوں۔ تمکو کن کن باتوں کی یاد دلاؤں۔
میرا دل ایسا کمزور ہے کہ جب کبھی ان باتوں کی طرف خیال جاتا ہے تو عجب بیچینی سی
ہو جاتی ہے۔ کمی سی معلوم ہونے لگتی ہے۔ ایک بڑا بیچین کرنیوالا۔ بڑا با مزہ۔ بہت
تڑپانیوالا۔ بہت پُر حسرت درد محسوس ہونے لگتا ہے۔ جانتی ہوں کہ تم نہیں آ رہے ہو
او نہ آؤ گے مگر بار بار دروازہ پر جا کر کھڑی ہو جاتی ہوں کہ تم آ تو نہیں گئے۔ آجکل تمہارے
لئے ایک ریشمی بوٹے دار قمیض تیار کر رہی ہوں۔ جی چاہتا ہے تم یہاں آتے۔ بس کہتی
ذرا ٹھہرو۔ دیکھو ٹھیک کٹی ہے یا نہیں۔ تب سلائی طے کرنے لگتی۔ تم کچھ ہو دیتے۔
میں کچھ اور مانگتی۔ مگر لو۔ ایسی باتیں نہ کرونگی۔ تمہارا ہرج ہوگا۔
کل شام کو یہاں ایک بڑا دلفریب تماشہ دیکھنے میں آیا۔ یہ دھوبیوں کا ناچ تھا۔
پندرہ بیس آدمیوں کی ایک جماعت تھی۔ اُن میں ایک نوجوان شخص سفید پشواز پہنے
کمر میں بیشمار گھنٹیاں باندھے پیر میں گھونگھرو پہنے۔ سر پر ایک لال ٹوپی رکھے ناچ رہا ہے
جب یہ شخص ناچتا ہے تو مردنگ بجنے لگتی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ یہ لوگ ہولی کا انعام
مانگنے آتے ہیں۔ یہ ذات بھی عجیب انعام لینے والی ذات ہے۔ آپ کے یہاں کوئی
کام کاج پڑے تو انہیں انعام دیجئے۔ اور ان کے یہاں کوئی کام کاج ہو تو بھی انعام
دئے جائیے۔ یہ لوگ ناچتے وقت گیت نہیں گاتے۔ ان کا گانا ان کی شاعری

ہے۔ پیشہ ور والا شخص ڈھول پر ہاتھ رکھکر ایک برہا کہتا ہے دوسرا آدمی سامنے سے آکر اس برہے کا جواب دیتا ہے۔ اور دونوں فی البدیہہ کہتے ہیں۔ اس ذات میں شاعرانہ قابلیت بہت زیادہ ہے۔ ان برہوں کو غور سے سنو تو اُن میں بعض نہایت باریک شاعرانہ خیالات ادا کئے جاتے ہیں۔ پیشہ ور والے شخص نے پہلا برہا جو کہا تھا اُسکے یہ معنی تھے۔ کہ اے دھوبی کے بچو تم کس کے دروازہ پر آ کھڑے ہو۔ دوسرے نے جواب دیا تھا۔ اب نہ اکبر شاہ ہے نہ راجہ بھوج۔ اب جو ہیں ہمارے مالک ہیں۔ اُنہیں سے مانگو۔ تیسرے برہے کا مطلب تھا کہ منگتوں کی عزت کم ہو جاتی ہے اس لئے تم لوگ کچھ سوال مت کرو۔ گا بجا کر چلے چلو۔ دینے والا بن مانگے ہی دیگا۔ گھنٹہ بھر تک یہ لوگ برہے کہتے رہے۔ تمہیں یقین نہ آئیگا۔ اُن کے مُنہ سے برہے اس طرح بے تکلف نکلتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ شاید اتنی آسانی سے وہ بات چیت بھی نہ کر سکیں۔ یہ ذات بڑی بلانوش ہے۔ نتھا دھوبی پکڑ شراب پانی کی طرح پیتے ہیں بیاہ میں شراب۔ گونے میں شراب۔ پنچایت میں شراب۔ پوجا پاٹ میں شراب۔ انعام مانگیں گے تو پینے کے لئے۔ دھالی مانگیں گے تو یہ کہہ کر کہ آج پینے کو پیسہ نہیں ہے رخصت ہوتے وقت بچو دھوبی نے جو دعائیہ برہا کہا تھا وہ شاعرانہ استعارات سے بھرا ہوا ہے۔

تمہارا پریوار اس طرح بڑھے جیسے گنگا کا پانی۔ لڑکے پھلیں پھولیں جیسے آم کی بَور۔ مالکن کا سُہاگ سدا بنا رہے جیسے دُوب کی سریالی۔ کیسی نادر شاعری ہے۔ زیادہ بجز اشتیاقِ دیدار کے اور کیا لکھوں؟

تمہاری برجن

(٧)

مجھگاؤں

پیارے۔ ایک ہفتہ تک خاموش رہنے کی معافی چاہتی ہوں۔ خوب! آپکو شکوہ
شکایت کا کیسا نادر موقع ہاتھ آیا ہے۔ واہ رے ہٹ دھرمی۔ مجھ پر یہ الزام کہ ہفتوں سدھ
نہیں لیتی ہو۔ بجائے ملنے کے میرے خطوط گن کر دیکھو۔ ابھی کچھ نہیں تو پندرہ بیس چٹھیوں
کے دیندار ہو گئے۔ مجھے اس ہفتہ میں بالکل فرصت نہیں ملی۔ مادھوری بیمار ہو گئی تھی۔
پہلے تو کونین کی چند پڑیاں کھلائی گئیں مگر جب اس سے افاقہ نہ ہوا اور اسکی حالت
بہت خراب ہو گئی تو دھلو رائے بید بلائے گئے۔ کوئی پچاس کا سن ہوگا۔ برہنہ
سر پر ایک پگڑی باندھے۔ کندھے پر انگوچھا رکھے۔ ہاتھ میں موٹا سا سونٹا لئے
دروازہ پر آکر بیٹھ گئے۔ گھر کے بڑے زمیندار ہیں مگر ان کے بدن پر کسی نے سیدھی مرزائی
نہیں دیکھی۔ انہیں اتنی فرصت ہی نہیں کہ اپنی تن پروری کی طرف متوجہ ہوں۔ نواح
میں آٹھ دس کوس تک لوگ ان کے معتقد ہیں۔ نہ وہ حکیم کو جانیں نہ ڈاکٹر کو۔ انکا حکیم
ڈاکٹر جو کچھ ہیں وہ دھلو رائے ہیں۔ پیغام سنتے ہی آکر دروازہ پر بیٹھ گئے۔ ڈاکٹروں
کی طرح نہیں کہ پہلے سواری مانگیں گے وہ بھی چاق چوبند تاکہ ان کا وقت ضائع نہ ہو
آپکے گھر آکر ایسے خاموش بیٹھے رہیں گے گویا گونگے کا گڑ کھا گئے ہیں۔ مریض کو دیکھنے
جائیں گے تو اس طرح سہما گیں گے گویا کمرہ کی ہوا میں زہر بھری ہوئی ہیں۔ تشخیص مرض
تجویز دوا سب پانچ دو منٹ میں ختم! دھلو رائے ڈاکٹر نہ سہی مگر جتنے آدمیوں کو ان کی
ذات سے فیض پہنچتا ہے انکی تعداد کا اندازہ کرنا محال ہے۔ ہمدردی ان کا اصول ہے
اُنکی صورت دیکھتے ہی مریض کا آدھا روگ دور ہو جاتا ہے ان کے نسخے ایسے سہل

اور عام کہ بلا دام کوڑی خرچ کئے منوں بٹور لائے۔ تین ہی دن میں مادھوی چلنے پھرنے لگی۔ واقعی اس شخص کی دوا میں اعجاز ہے۔

یہاں ان دنوں مغلئے اُدھم مچائے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ جاڑے میں کپڑا دے جاتے ہیں اور جیٹھ میں دام وصول کر لیتے ہیں۔ اُس وقت کوئی عذر نہیں سنتے گالی گلوچ مار پیٹ سبھی باتوں پر اُتر آتے ہیں۔ دو تین آدمیوں کو بہت مارا۔ رادھا نے بھی کچھ کپڑے لئے تھے۔ اُس کے دروازے پر جا کر سب کے سب گالیاں بکنے لگے۔ تلسا نے اندر سے کواڑ بند کر لئے۔ جب یوں بس نہ چلا تو ایک نے موہنی گائے کھونٹے سے کھول لی اور کشاں کشاں لے چلا۔ اتنے میں رادھا دور سے آتا دکھائی دیا۔ آتے ہی آتے اس نے لاٹھی کا وہ بھرپور ہاتھ دیا کہ مغلئے کی کلائی لٹک پڑی۔ تب تو مغلئے گرم ہوئے۔ پینترے بدلنے لگے۔ رادھا بھی جان پر کھیل گیا اور دو تین بدمعاشوں کو بیکار کر دیا۔ اتنے میں کاشی بھر نے آ کر ایک مغلئے کی خبر لی۔ دلہوا ہے کو مغلیوں سے چڑ ہے وہ فخریہ کہا کرتے ہیں کہ میں نے انکا اتنا روپیہ دبا دیا۔ انہوں کو پٹوا دیا۔ یہ شور و غل سنتے ہی پہنچ گئے اور للکارا۔ صدہا آدمی لاٹھیاں لے لے کر دوڑ پڑے اور مغلیوں کی خوب مرمت ہوئی۔ یقین ہے کہ اب ادھر آنے کی جرأت نہ کریں گے۔

اب تو مئی کا مہینہ گزرا۔ کیا ابھی فرصت نہیں ملی۔ رات دن تمہارے آنے کا انتظار ہے۔ شہر میں بیماری کم ہو گئی۔ اور ہم لوگ بہت جلد یہاں سے چلے جائیں گے۔ افسوس تم اس پیارے گاؤں کی سیر نہ کر سکو گے۔

تمہاری برجن

(۸)

پیارے تمہاری خموشی مارے ڈالتی ہے۔ کل ہم لوگ شہر آگئے۔ اب تم بھی آؤ
وہاں پڑے پڑے کیا کر رہے ہو۔ سو تین خط لکھ چکی۔ مگر نہ آتے ہو نہ جواب دیتے ہو۔
رات دن آنکھیں دروازے پر لگی رہتی ہیں۔ رات کو آنکھیں نہیں جھپکیں۔ کتا بھونکا
اور میرا دل دھڑکنے لگا۔ بگھی کی آواز آئی اور میں چونک کر اٹھ بیٹھی۔ شاید مجھ سے ناراض
ہو۔ خیر یہاں کسی طرح آ تو جاؤ۔ تمہاری ناراضگی کا علاج تو میرے پاس ہے۔ اب
رخصت ہوتی ہوں چراغ کے سامنے نہیں بیٹھا جاتا۔ ایشور کرے سویرے تمہارا
درشن ہو اور یہ خط گھومتا ہوا یہیں آوے

تمہاری برجن

(۹)

پیارے! لالہ جی کو خط لکھا اور مجھے نہیں۔ میں نے ایسا کیا قصور کیا تھا۔ خیر
شکر ہے تم خیریت سے تو ہو۔ میرے لئے یہی بہت ہے اب آنے کے لئے کبھی
کہونگی۔ جو کچھ دل پر بیتیگی سہہ لونگی کس کے آگے روئے۔ اپنا دیدہ کھوئے — لو
رخصت! بہتر ہے مراد آباد آجاؤ۔ یہاں تمہارا کون ہے؟

تمہاری برجن

بالکرام اور کملاچرن

پرتاپ چند کو الہ آباد کالج میں پڑھتے تین سال ہو چکے تھے اور اس عرصے میں
اُس نے اپنے ہم چشموں اور اتالیقوں کی نگاہوں میں بہت ممتاز درجہ حاصل کر لیا تھا۔ کالج
کی زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہ تھا جہاں اُس کے کمالات نے قدردانی کا سہرا نہ پہنا ہو۔
پروفیسر اس پر فخر کرتے اور طلبا اُسے اپنا رہنما سمجھتے۔ جس طرح کھیل کے میدان میں اُس کا
دستِ اعجاز نمایاں تھا اسی طرح لیکچر روم میں اُس کی قابلیت اور نکتہ رسی مسلمہ تھی۔ کالج
کے متعلق ایک عام انجمن احباب قائم کی گئی تھی۔ شہر کے علم دوست رؤسا کالج کے پروفیسر
اور طلبا سب اُس کے ممبر تھے۔ پرتاپ اس انجمن کا ماہِ درخشاں تھا۔ یہاں ملکی و تمدنی
مسائل پر مباحثے ہوا کرتے تھے اور پرتاپ کی تقریریں ایسی پُرزور اور مدلل ہوتیں کہ پروفیسر اُس
کو بھی اُس کی وسعتِ تحقیقات اور تلاش پر حیرت ہوتی۔ اُس کی تقریر اور تحریر دونوں ہی میں
جادو تھا۔ جس وقت وہ اپنا سادہ لباس پہنے ہوئے پلیٹ فارم پر جاتا تو حاضرین کی آنکھیں
اُس کی طرف اٹھ جاتیں اور دلوں میں گدگدی ہونے لگتی۔ اُس کا اندازِ تقریر، اُس کے اشارے
اس کا لب و لہجہ، اُس کے اعضا کی حرکت سبھی ایسے مؤثر تھے کہ اُس کی تقریر میں گویا قدرت نے اثر
بھر دیا ہے۔ جب تک وہ پلیٹ فارم پر رہتا حاضرین پر ایک تسخیر کا عالم ہوتا۔ مرحبا کے
نعرے بار بار بلند ہوتے۔ اُس کا ایک ایک فقرہ دلوں میں چبھ جاتا اور زبان سے
بے اختیار واہ واہ کا شور بلند ہوتا۔ اسی خیال سے اُس کی تقریریں عموماً اختتام کے وقت

ہوا کرتی تھیں۔ کیونکہ زیادہ تر شرکا محض صرف اُس کی گرم زبانیوں کا لُطف اٹھانے
کیلئے آیا کرتے تھے۔ اُسکے الفاظ اور انداز میں خدا داد اثر تھا جو قوت کسب سے بہت بلند
ہے۔ ادب اور تاریخ اُسکے تحقیقات اور مطالعہ کے خاص صیغے تھے۔ قوموں کے عروج اور
زوال اور اُسکے اسباب و حالات پر وہ اکثر تقریریں کرتا۔ اسوقت اس کے ان جگر کاویوں
کے محرک زیادہ تر حاضرین کے نعرہ ہائے تحسین ہوتے تھے۔ اور انہیں کو وہ اپنی محنت کا کافی
بدل سمجھتا تھا۔ ہاں اُسکے مذاق کی یہ روش دیکھکر البتہ قیاس کیا جا سکتا تھا کہ یہ ہونہار
بروا آگے چلکر کیسے پھل پھول لائیگا اور کیسے رنگ روپ نکالیگا۔ ابھی تک اُس نے ایک لمحہ
بھی غور نہیں کیا تھا کہ میری آئندہ زندگی کی کیا صورت ہوگی۔ کبھی سوچتا پروفیسر بنونگا
اور خوب کتابیں لکھونگا۔ کبھی وکالت کی طرف میلان دوڑاتا۔ کبھی سوچتا کاش وظیفہ مل
جائے تو سول سروس کی تیاری کروں۔ کسی ایک طرف خیال نہ جمتا تھا۔

مگر پرتاپ چند اُن طلبا میں سے نہ تھا جنکی تمام کوششیں مباحثے اور کتابوں ہی
تک محدود رہتی ہیں۔ اُسکے وقت اور لیاقت کا ایک قلیل حصہ رفاہِ عام کے کاموں میں
بھی صرف ہوتا تھا۔ اس لئے خلقتاً ایک ہمدرد اور غریب پرور دل پایا تھا اور عوام میں
ملنے جلنے اور کام کرنے کی لیاقت اُسے باپ سے وراثت میں ملی تھی۔ انہیں مشاغل میں
اُسکی توجہ اور سرگرمی پورے جوش کے ساتھ ظاہر ہوتی۔ اکثر شام کے وقت وہ کیٹ گنج
کٹرہ کی متعفن گلیوں کی خاک چھانتا دکھائی دیتا جہاں زیادہ تر نیچی ذاتیں آباد ہیں
اُسکی عزت ان حصوں میں بہت مانوس تھی۔ جن لوگوں کے سایہ سے اونچی ذات
کا ہندو دور بھاگتا ہے اُن کے ساتھ پرتاپ ٹوٹی کھاٹ پر بیٹھکر گھنٹوں باتیں
کرتا اور یہی وجہ تھی کہ ان محلوں کے بسنے والے اُس پر فدا ہونیکو تیار تھے۔ محنت اور

عیش پرستی یہ دو عیوب پرتاپ چند میں نام کو بھی نہ تھے۔ کوئی بیکس آدمی ہو پرتاپ اُسکی
دستگیری کے لئے تیار رہتا تھا۔ کوئی بیکس مریض ہو پرتاپ اُسکا سچا غمخوار اور تیماردار تھا۔
کتنی راتیں اُس نے جھونپڑوں میں کراہتے ہوئے مریضوں کے سرہانے کھڑے رہکر کاٹی
تھیں۔ اسی غرض سے اُس نے رفاہ عام کی ایک سبھا قائم کر رکھی تھی اور ڈھائی سال کے
مختصر زمانے میں اس انجمن نے جتنی کارگزاری سے پبلک کی سیوا کی تھی۔ اُس نے الہ آبادیوں
کی ہمدردی اس طرف متوجہ کر دی تھی پرتاپ اس انجمن کا روح رواں تھا۔ پچھلے دو
سالوں سے اس نے [illegible] بھی جبکہ لوگ اپنے [illegible] جان
بچھو [illegible] لحہ کرنا شروع کر دیا تھا

[illegible] چند نے اسکی [illegible] آؤ بھگت کی [illegible]
[illegible] وہ [illegible] کی بیماری کی خبر پاکر
[illegible] سے [illegible] اسی وقت
[illegible] اس کے دل میں [illegible] نہیں پائی جو میرے لئے
[illegible] کیلئے کافی تھا۔ مثلاً [illegible] اکثر یہ خیال
[illegible] تھا۔ کہ [illegible] کا قاتل ہوں۔ میری ہی بد نہادیوں اس غریب کی
جان [illegible] جبکہ سوشیلا نے مرتے وقت اُسے [illegible] کر لئے
[illegible] نکی تھی پرتاپ نے دل میں ارادہ کر لیا تھا کہ موقع ملا تو میں اس گناہ
کی تلافی ضرور کرونگا۔ کملا چرن کی خاطر و مدارت اور تعلیم و تربیت میں اُسے کسی حد
تک پرائشچت کے پورے کرنے کا نادر موقع ہاتھ آیا۔ اگرچہ علم و شعور میں وہ کملا چرن
سے منزلوں آگے تھا۔ مگر اُس سے یوں پیش آتا تھا جیسے چھوٹا بھائی بڑے بھائی کے ساتھ۔

اپنے وقت کا کچھ حصہ اسکی مدد کرنے میں صرف کرتا اور ایسی سہولت سے اتالیق کا فرض ادا
کرتا کہ تعلیم ایک دلچسپ مباحثہ کی صورت اختیار کر لیتی۔

مگر پرتاپ چند کی ان کوششوں کے باوجود کملاچرن کی طبیعت یہاں بہت گھبراتی
سارے بورڈنگ ہاؤس میں اُسکے مذاق کا ایک آدمی بھی نہ تھا جس سے وہ اپنا دردِ دل کہتا اور
اپنے زخمِ جگر پر مرہم رکھواتا۔ وہ یار باش، بےفکر، رنگین مزاج آدمی تھا جس نے آج کے سوا کل
کا کبھی خیال نہیں کیا۔ پرتاپ سے باوجود بےتکلفی کے وہ دل کی بہت سی باتیں نہ کہہ سکتا تھا۔ جب
اکیلے پن سے طبیعت بہت اُکتاتی تو برجن کو کوسنے لگتا کہ میرے سر پر یہ سب مصیبتیں اسی کی لائی
ہوئی ہیں۔ اُسے مجھ سے اُنس نہیں، زبان اور قلم کی محبت بھی کوئی محبت ہے۔ وہ محبت ہی کیا جو موقع
اور مصلحت کی آڑ ڈھونڈھنے لگے۔ میں چاہے اُن پر جان ہی کیوں نہ دیدوں مگر اُنکی محبت زبان
اور قلم کے دائرہ سے باہر نہ نکلیگی۔ ایسے بُت کے روبرو جو پسیجنا جانتا ہی نہ ہو سر ٹپکنے سے کیا حاصل۔ ان
خیالات نے یہانتک زور پکڑا کہ اُسنے برجن کو خط لکھنا چھوڑ دیا۔ وہ بیچاری اپنے خطوط میں کلیجہ
نکال کر رکھدیتی مگر کملا جواب تک نہ دیتا اور دیتا بھی تو خشک اور دلشکن۔ اسوقت اُسے برجن کی
ایک ایک بات۔ اُسکی ایک ایک حرکت اُسکی سردمہری کا پتہ دیتے ہوئے معلوم ہوتی تھی۔ ہاں اگر
یاد نہ آتی تھیں تو برجن کی خاطرداریاں اور دلسوزیاں۔ وہ نشیلی آنکھیں جو اُس سے جُدا ہوتے
وقت ڈبڈبا گئیں تھیں اور وہ نازک ہاتھ جنہوں نے باہم ملکر اُس سے منتیں کی تھیں
کہ خط برابر بھیجتے رہنا۔ اُسے یاد آجاتے تو ممکن تھا کہ اُسے کچھ تسکین ہوتی مگر ایسے موقعوں
پر انسان کا حافظہ دھوکا دیدیا کرتا ہے۔

آخر کملاچرن نے اپنی تنہائی کا ایک مشغلہ سوچ ہی نکالا جسوقت سے اس نے ہوش
سنبھالا تھا اسیوقت سے بازارِ حُسن کی سیر شروع کی۔ حُسن پرستی اُسکا خمیر ہو گئی تھی اور اس قسم کا

کوئی نہ کوئی مشغلہ اُس کیلئے ایسا ہی ضروری تھا جیسے بدن کیلئے غذا۔ بورڈنگ ہاؤس
سے ملا ہوا ایک سیٹھ کا باغیچہ تھا اور اُسکے رکھ رکھاؤ کیلئے ایک مالی نوکر تھا۔ اس مالی کے
ایک دوشیزہ لڑکی سرجودیئی تھی۔ اگرچہ بہت حسین نہ تھی مگر کملا حُسن کا اتنا طلبگار نہ تھا۔
جتنا کسی دلبستگی کے مشغلہ کا۔ کوئی صورت جسکے چہرہ پر شباب کی جھلک ہو اُس کا دل
بہلانے کے لئے موزوں تھی کملا اس لڑکی پر ڈورے ڈالنے لگا۔ شام سویرے بلا ناغہ چمن کی
روشوں میں ٹہلتا نظر آتا اور لڑکے تو میدان میں ورزش کرتے مگر کملا چرن باغیچہ میں آکر
تاک جھانک میں مصروف رہتا۔ رفتہ رفتہ اُس نے سرجودیئی سے شناسائی۔ ہمدردی
اور پھر محبت پیدا کرلی وہ اس سے گجرے مول لیتا اور نقد قیمت کے علاوہ چوگنے
دام دیتا۔ مالی کو تہوار کے موقع پر سب سے زیادہ تہواری کملا چرن ہی سے ملتی یہاں تک
کہ سرجودیئی اُس کے دامِ الفت کی اسیر ہوگئی اور دو ایک بار تاریکی کے پردہ میں باہم
ملاقاتیں بھی ہوئیں۔

ایک روز شام کا وقت تھا سب طلبا سیر کو گئے ہوئے تھے کملا اکیلا باغیچہ میں
ٹہلتا تھا اور رہ رہ کر مالی کے جھونپڑے کی طرف جھانکتا تھا۔ یکایک جھونپڑے میں سے سرجو
دیئی نے اُسے اشارہ سے بُلایا اور کملا بڑی تیزی سے اندر گھس گیا۔ آج سرجودیئی نے
ململ کی ساڑی پہنی تھی جو کملا بابو کا تحفہ تھا۔ سر میں خوشبودار تیل ڈالا تھا جو کملا بابو
بازار سے لائے تھے اور ایک چھینٹ کا سلوکا پہنے ہوئے تھی جو انہیں بابو صاحب نے
بنوا دیا تھا۔ یہ سب کملا بابو کی خاطر تھی۔ اپنی طرف سے سرجودیئی نے صرف آنکھوں میں
کاجل لگایا تھا۔ آج وہ اپنی نگاہ میں بہت حسین معلوم ہوتی تھی۔ ورنہ کملا جیسا
امیر اور حسین آدمی کیوں اس پر جان دیتا۔ کملا کھٹولے پر بیٹھا ہوا سرجودیئی کی اداؤں

کو شتانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اُسے اُسوقت سرجو دیبی بج رانی سے کسی طرح کم حسین نہیں نظر آتی تھی۔ رنگت میں ذرا سا فرق تھا مگر یہ کوئی ایسا بڑا فرق نہیں اُسکی نگاہ میں سرجو دیبی کی محبت سچی اور زیادہ پُرجوش معلوم ہوتی تھی کیونکہ وہ جب بھی بنارس جانیکا تذکرہ کرتا تو سرجو دیبی زار زار رونے لگتی اور کہتی کہ مجھے بھی لیتے چلو میں تمہارا ساتھ نہ چھوڑونگی۔ کہاں یہ محبت کی گرمی اور جذبات کا زور اور کہاں برجن کی نیم دلانہ خاطرداریاں اور بیرحمانہ مصلحت آمیزیاں۔

کملا ابھی اچھی طرح آنکھوں کو سینکنے بھی نہ پایا تھا کہ یکایک مالی نے دروازہ آکر کھٹکھٹایا۔ اب تو کاٹو تو بدن میں لہو نہیں چہرہ کا رنگ اڑ گیا۔ سرجو دیبی سے گڑگڑا کر بولا "میں کہاں جاؤں" سرجو دیبی کے آپ ہی ہوش اُڑے ہوئے تھے۔ گھبراہٹ میں زبان سے کچھ بات نہ نکلی اتنے میں مالی نے پھر زنجیر کھٹکھٹائی چار و ناچار سرجو دیبی بے بس تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے ایک کواڑ کھول لیا۔ کملا چرن ایک کونے میں دبک کر کھڑا ہو گیا۔

جس طرح بھینٹ کا بکرا کٹار کے تلے تڑپتا ہے اسی طرح کونے میں گھسنے والے کملا کا دل اسوقت تڑپ رہا تھا۔ وہ اپنی زندگی سے مایوس تھا۔ ایشور کو صدق دل سے یاد کر کے کہہ رہا تھا کہ اگر ابکی اس مصیبت سے رہا ہو جاؤں تو پھر کبھی ایسی حرکت نہ کرونگا۔

اتنے میں مالی کی نگاہ حضرت پر پڑی۔ پہلے تو کچھ گھبرایا پھر نزدیک آ کر بولا:۔ "یہ کون کھڑا ہے۔ یہاں کون ہے؟"

اتنا سننا تھا کہ کملا چرن تیزی سے باہر نکلا اور پھاٹک کی طرف بگٹٹ بھاگا۔ مالی ایک ڈنڈا ہاتھ میں لئے "لینا لینا بھاگنے نہ پاوے" کے نعرے مارتا پیچھے پیچھے دوڑا۔

یہ وہی کملا ہے جو مالی کو انعام واکرام دیا کرتا تھا اور جس سے مالی سرکار اور حضور کہہ کہہ کر باتیں
کرتا تھا وہ کملا آج اسی مالی کے سامنے اس طرح جان بچا کر بھاگا جاتا ہے۔ گناہ آدمی کا
وہ گُنڈا ہے جو عزت و حرمت۔ حوصلہ و ہمّت کو دم زدن میں جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔

کملا چمن درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں دوڑتا ہوا پھاٹک سے باہر نکلا۔ سڑک پر
ٹریم جا رہی تھی اس پر جا بیٹھا اور ہانپتے ہانپتے بے دم ہو کر گاڑی کے تختہ پر دھم سے گر
پڑا۔ اگرچہ مالی نے پھاٹک تک بھی پیچھا نہ کیا مگر کملا ہر ایک آنے جانے والے پر چونک چونک کر
نگاہیں ڈالتا تھا گویا سارا زمانہ اس کا دشمن ہو گیا ہے۔ کمبختی نے ایک اور گل کھلایا۔ اسٹیشن
پر پہنچتے ہی گھبراہٹ کا مارا ریل گاڑی میں جا کر بیٹھ تو گیا مگر ٹکٹ لینے کی سُدھ ہی
اور نہ معلوم ہوا کہ میں کدھر جا رہا ہوں۔ وہ اس وقت اس شہر سے بھاگ جانا چاہتا تھا
خواہ کہیں ہو۔ کچھ دور چلا تھا کہ ایک انگریز ریلوے افسر لالٹین لئے آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس
کے ساتھ ایک کنسٹبل بھی تھا۔ وہ مسافروں کا ٹکٹ دیکھتا چلا آتا تھا۔ مگر کملا نے
سمجھا پولیس کا کوئی افسر ہے۔ دہشت کے مارے ہاتھ پاؤں سنسنانے لگے اور کلیجہ
میں دھڑکن ہونے لگی۔ جب تک وہ دوسری گاڑیوں میں معائنہ کرتا رہا تب تک تو وہ
کلیجہ مضبوط کئے بیٹھا۔ مگر جوں ہی اس کے کمرہ کا دروازہ کھلا کملا کے ہاتھ پیر
پھول گئے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ ایک لحظہ تک عالم بیخودی میں دوسری طرف
کا دروازہ کھول کر چلتی ہوئی ریل پر سے نیچے کود پڑا۔ کنسٹبل اور ٹکٹ والے صاحب نے
اُسے یوں کودتے دیکھا تو سمجھے کوئی مشاق ڈاکو ہے۔ مارے خوشی کے پھولے نہ سمائے کہ
انعام الگ ملیگا اور ترقی اوپر سے ہوگی فوراً سرخ لالٹین دکھائی۔ ذرا دیر میں گاڑی رک گئی
اب گارڈ اور کنسٹبل اور ٹکٹ والے صاحب مع چند دوسرے آدمیوں کے گاڑی سے اُتر پڑے۔

اور لالٹین لے لے کر اِدھر اُدھر تلاش کرنے لگے۔ کسی نے کہا اب اُس کا گرد بھی نہیں ملنے کا۔ پکا ڈکیت تھا۔ کوئی بولا ان لوگوں کو کالی جی کا اشٹ رہتا ہے جو کچھ نہ کر دکھائیں تھوڑا ہے۔ مگر گارڈ آگے ہی بڑھتا گیا۔ ترقی کی اُمید اُسے آگے لئے جاتی تھی یہاں تک کہ وہ اس مقام پر آ پہنچا جہاں کملا گاڑی سے کودا تھا۔ اتنے میں کنسٹبل نے خندق کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ دیکھو وہ سفید سفید چیز کیا ہے۔ مجھے تو کوئی آدمی معلوم ہوتا ہے اور لوگوں نے بھی دیکھا اور یقین ہو گیا کہ ضرور یہی بدمعاش یہاں چھپا ہوا ہے چلکر بچہ کو گھیر لو کہ کہیں نکلنے نہ پاوے۔ ذرا سنبھلے ہوئے رہنا۔ ڈاکو جان پر کھیل جاتے ہیں۔ گارڈ صاحب نے پستول سنبھالا۔ میاں کنسٹبل نے لاٹھی تانی۔ چند مسافروں نے جوتے اُتار اُتار کر ہاتھوں میں لئے کہ کہیں وار کر بیٹھا تو بھاگنے میں آسانی ہوگی۔ دو چار آدمیوں نے ڈھیلے اُٹھا لئے کہ دُور ہی سے نشانہ لگائیں گے۔ ڈاکو کے نزدیک کون جائے۔ کسے جان بھاری پڑی ہے۔ مگر جب لوگوں نے نزدیک جا کر دیکھا تو نہ ڈاکو نہ ڈاکو کا بھائی بلکہ ایک شریف صورت، سبزہ آغاز، چھریرے بدن کا نوجوان بے حس و حرکت زمین پر اوندھے منہ پڑا ہے اور اُس کی ناک اور کان سے آہستہ آہستہ خون بہہ رہا ہے۔ برجن کا لال سرجودیئی نے چھین کر زمین پر پٹک دیا۔ کملا نے اِدھر دم توڑا اور برجن ایک بھیانک خواب دیکھکر چونک پڑی۔ سرجودیئی لئے برجن کا سہاگ لوٹ لیا۔ شراب محبت کا دور ایسا بند ہوا کہ نہ ساقی رہا نہ ساغر۔ سب خاک میں مل گئے۔

ہجومِ غم

سہاگن عورت کے لئے اُس کا شوہر دُنیا کی سب سے پیاری چیز ہوتی ہے وہ اُسی کے
لئے جیتی ہے اور اُسی کے لئے مرتی ہے۔ اُس کا ہنسنا بولنا اُسی کو خوش کرنے کے لئے اور
اُسکا بناؤ سنگار اُسی کے لبھانے کے لئے ہوتا ہے۔ اُسکا سہاگ اُسکی مسرت اور
زندگی ہے اور سہاگ کا اُٹھ جانا اُسکی زندگی اور جانداری کا خاتمہ۔

کملا چرن کی بے ہنگام موت برج رانی کے لئے موت سے کم نہ تھی۔ اُس کی زندگی
کی آرزوئیں اور ولولے سب مٹی میں مل گئے۔ کیا کیا ارادے تھے اور کیا ہو گیا۔ مرحوم
مرنے والے کی صورت اُسکی آنکھوں میں پھرا کرتی تھی۔ اگر ذرا دیر کیلئے آنکھیں جھپک جاتیں
تو اُسکی تصویر ہو بہو آنکھوں کے سامنے آجاتی۔

بعض اوقات آفاتِ ارضی و سماوی کو کسی خاص شخص یا خاندان سے اُنس سا ہو
جاتا ہے کملا چرن کا داغ مُرجھانے بھی نہ پایا تھا کہ بابو شیاما چرن کی باری آپہنچی۔
شاخوں کے کاٹنے سے درخت کو مُرجھاتے دیکھکر ابکی آسمان نے جڑ ہی کاٹ دی۔ رامدین
پانڈے بڑا کینہ ور شخص تھا جبتک ڈپٹی صاحب مجگاؤں میں تھے دبکا بیٹھا رہا مگر جوں
ہی وہ شہر کو لوٹے اسی دن سے اُس نے اودھم مچانا شروع کر دیا سارا گاؤں کا گاؤں اُس
کا دُشمن تھا۔ جن نگاہوں سے مجگاؤں والوں نے ہولی کے دن اسکی طرف دیکھا تھا وہ
نگاہیں اور تیور اُسکے کلیجہ میں کانٹے کی طرح کھٹک رہے تھے۔ جس حلقہ میں مجگاؤں

واقع تھا اُس کے تھانہ دار صاحب ایک بڑے گھاگ۔ آزمودہ کار راشی تھے۔
ہزاروں کی رقمیں ہضم کر جائیں مگر ڈکار تک نہ لیں۔ مقدمے بنانے اور ثبوت پہنچانے
میں ایسے مشاق کہ راہ چلتے آدمی کو پھانس دیں اور پھر کسی کے چھڑائے نہ چھوٹے۔
حکام سب اُن کے ہتھکنڈوں سے واقف تھے مگر اُنکی ہوشیاری اور معاملہ دانی کے
مقابلہ میں کسی کا کچھ بس نہ چلتا تھا۔ رامدین ان تھانہ دار صاحب سے ملا اور اپنے زخمِ جگر کی
دوا مانگی۔ اسکے ہفتہ بھر بعد مجگاؤں میں ڈاکہ پڑ گیا۔ ایک مہاجن شہر سے آرہا تھا۔ رات
کو نمبردار کے یہاں ٹھہرا۔ ڈاکوؤں نے اسے لوٹ کر گھر نہ جانے دیا۔ صبح کو تھانہ دار
صاحب تحقیقات کو آئے اور ایک ہی رسّی میں سارے گاؤں کو باندھ لے گئے۔

حسنِ اتفاق سے مقدمہ بابو شیاما چرن کے اجلاس میں پیش ہوا انہیں پہلے
سے سارا کچا چٹھا معلوم تھا اور یہ تھانہ دار صاحب بہت دنوں سے انکی آنکھوں پر چڑھے
ہوئے تھے انہوں نے ایسی ایسی موشگافیاں کیں اور ایسے ایسے نکتے نکالے کہ تھانہ دار
صاحب کی قلعی کھل ہی گئی۔ چھ مہینے تک مقدمہ چلا اور دھوم سے چلا۔ سرکاری
وکیلوں نے بڑے بڑے زور لگائے۔ مگر گھر کے بھیدی سے کیا چھپ سکتا تھا۔ نتیجہ
یہ ہوا کہ ڈپٹی صاحب نے سب ملزموں کو بے داغ رہا کر دیا اور اسی دن شام کو تھانہ
دار صاحب معطل کر دیے گئے۔

جب ڈپٹی صاحب فیصلہ سنا کر لوٹے تو ایک جمعدار اہلکار نے کہا۔ حضور
تھانہ دار صاحب سے ذرا ہوشیار رہئیے گا آج بہت جھلّایا ہوا تھا۔ پہلے بھی دو تین
افسروں کو زک دے چکا ہے آپ پر بھی ضرور وار کریگا۔ ڈپٹی صاحب نے سنا اور مسکرا کر اس
آدمی کا شکریہ ادا کیا مگر اپنی حفاظت کے لئے مزید انتظام نہ کر سکے۔ انہیں یہ بزدلانہ

خیال معلوم ہوتا تھا۔ رادھا اُسے بہت ضد کرتا رہا کہ میں آپ کے ساتھ رہونگا۔ کاشی بھر بھی بہت پیچھے پڑا رہا مگر اُنہوں نے کسی کو ساتھ نہ رکھا اور حسب معمول اپنا فرض انجام دیتے رہے۔
ظالم خاں بات کا دھنی تھا وہ زندگی سے ہاتھ دھو کر بابو شیاما چرن کے پیچھے پڑ گیا۔ ایک روز وہ سیر کر کے شیو پور سے کچھ رات گئے واپس آ رہے تھے کہ پاگلخانہ کے قریب کچھ دیکھ کر فٹن کا گھوڑا بدکا۔ گاڑی رک گئی اور دم زدن میں ظالم خاں نے ایک درخت کی آڑ سے نکلکر پستول کا نشانہ لگایا پٹاخے کی آواز ہوئی اور بابو شیاما چرن کے سینہ سے گولی پار ہو گئی۔ پاگل خانہ کے گارد کے سپاہی دوڑے اور ظالم خاں کو گرفتار کر لیا سائیس نے اُسے بھاگنے نہ دیا تھا۔
اس حادثے نے خاندان کی تباہی کا سامان پورا کر دیا۔ پرمیوتی یوں تو بہت نیک مزاج اور محبتی عورت تھی مگر ان حادثات نے اُسکے مزاج اور برتاؤ میں یکایک بڑی تبدیلی پیدا کر دی۔ اس کے حواس میں فرق آ گیا۔ بات بات پر برجن سے چڑ جاتی اور طعنے مارنے لگتی۔ اُسے خدا جانے کیونکر وہم ہو گیا تھا کہ یہ سب آفت اسی بہو کی لائی ہوئی ہے۔ یہی سبز قدم جب سے گھر میں آئی گھر ستیاناس ہو گیا۔ اس کا پیرا خراب ہے۔ کئی دفعہ اس نے کھول کر برجن سے کہہ بھی دیا تھا کہ تمہاری چکنی صورت نے مجھے موہ لیا۔ میں کیا جانتی تھی۔ کہ تمہارے چرن ایسے منحوس ہیں۔ برجن یہ باتیں سُنتی اور کلیجہ مسل کر رہ جاتی۔ جب دن ہی بُرے آ گئے تو بھلی باتیں کیونکر سُننے میں آئیں۔ یہ آٹھوں پہر کی کوفت اُسے حسرت کے آنسو بھی نہ بہانے دیتی۔ آنسو نکلتے ہیں جب کوئی ہمدرد ہو اور دلسوزی کرے۔ کوفت اور لعن طعن کی آگ سے آنسو خشک ہو جاتا ہے
ایک روز برجن کا جی گھر میں بیٹھے بیٹھے ایسا گھبرایا کہ وہ ذرا دیر کیلئے باغیچہ میں

چلی آئی۔ آہ اس باغیچہ میں کیسے کیسے لطف کے دن گزرے تھے۔ اس کا ایک ایک پودا
مرنے والے کی محبت بیگماں کا یادگار تھا۔ کبھی وہ دن بھی تھے کہ ان پھولوں اور
پتیوں کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو جاتا تھا اور نسیم دل پر غموں کا نشہ پیدا کر دیا کرتی تھی
یہی وہ مقام ہے جہاں بہت سی شامیں آغوشِ اُلفت میں گزری تھیں اور جہاں
شرابِ محبت کے دور چلے تھے۔ اسوقت پھولوں کی پنکھڑیاں اپنے نازک
ہونٹوں سے اُس کا خیر مقدم کرتی تھیں۔ مگر افسوس! آج ان کے سر جھکے ہوئے تھے
اور زبانیں بند تھیں کیا یہ وہ جگہ نہ تھی جہاں "البیلی مالن" پھولوں کا ہار گوندھتی تھی مگر بھولی مالن
کو کیا معلوم تھا کہ اسی جگہ اُسے اپنی آنکھوں سے نکلے ہوئے موتیوں کے ہار گوندھنے پڑیں گے
انہیں خیالوں میں برجن کی نگاہیں اس کنج کی طرف اُٹھ گئیں جہاں سے ایک بار کملا چرن
مسکراتا ہوا نکلا ہوا تھا۔ گویا وہ پتیوں کی جنبش اور اُسکے کپڑوں کی جھلک دیکھ رہی
ہے۔ اس کے چہرے پر اس وقت ہلکی سی مسکراہٹ نمودار تھی جیسے گنگا میں ڈوبتے ہوئے
آفتاب کی زرد اور ملین کرنوں کا عکس پڑتا ہے۔ یکایک پریموتی نے آ کر کرخت
آواز میں کہا "اب آپ کو سیر کرنے کا شوق چرایا ہے؟"

برجن کھڑی ہو گئی اور روتے ہوئے بولی۔ "اماں مجھے نارائن نے بھلا اُسے
آپ کیا کھلتی ہیں؟"

آخر پریموتی شہر سے ایسی بیزار ہوئی کہ ایک مہینہ کے اندر سب سامان اونے پونے
بیچ کر مجگاؤں چلی گئی۔ برج رانی کو ساتھ نہ لیا۔ اُسکی صورت سے اُسے نفرت ہو گئی تھی
برجن اس وسیع مکان میں اکیلی رہ گئی۔ مادھوی کے سوا اب اس کا کوئی غمخوار نہ تھا
سباما کو اپنی منہ بولی بیٹی کی مصیبتوں کا اتنا ہی صدمہ ہوا جتنا اپنی بیٹی کا ہوتا۔ کئی دن

تک روتی رہی ۔ اور کئی دن برابر اسے سمجھانے کے لئے آتی رہی ۔ جب برجن اکیلی رہ گئی تو سُباما نے چاہا کہ یہ میرے یہاں اُٹھ آئے اور آرام سے رہے ۔ خود کئی بار بلانے گئی مستری جی کو بھیجا مگر برجن کسی طرح آنے پر آمادہ نہ ہوئی ۔ اُسے خیال ہوتا تھا کہ سسر کو دُنیا سے سدھارے ابھی تین مہینے بھی نہ ہوا اتنی جلدی مکان خالی ہو جائیگا تو لوگ کہیں گے کہ اُنکے مرتے ہی ساس اور بہو لڑ مریں ۔ یہانتک کہ اُسکی اس ضد سے سُباما کا من موٹا ہو گیا ۔

مجگاؤں میں پریموتی نے ایک اندھیر مچا رکھا تھا ۔ اسامیوں کو سخت سُست کہتی ۔ کارندہ کے سر پر جُوتی پٹکدی ۔ پٹواری کو کوسا ۔ رادھا اہیر کی گائے زبردستی لے لی یہانتک کہ گاؤں والے گھبرا گئے اور بابو رادھاچرن سے شکایت کی ۔ رادھاچرن نے یہ کیفیت سنی تو یقین ہو گیا کہ ضرور ان صدمات نے اس کے حواس زائل کر دئے ہیں ۔ اسوقت کسی طرح ان کا دل بہلنا چاہیئے ۔ سیوتی کو لکھا کہ تم امّاں کے پاس چلی آؤ اور اس کے ساتھ کچھ دنوں رہو ۔ سیوتی کی گود میں اسوقت ایک چاندسا بچہ کھیل رہا تھا اور پران ناتھ دو مہینہ کی رخصت لیکر دربھنگہ سے لوٹے تھے ۔ راجہ صاحب کے پرائیویٹ سکریٹری ہو گئے تھے ۔ ایسے موقعے پر سیوتی کیونکر آسکتی ۔ تیاریاں کرتے کرتے مہینوں گزر گئے ۔ کبھی لڑکا بیمار پڑ گیا کبھی ساس روٹھ گئی ۔ کبھی ساعت نہ بنی ۔ آخر چھٹویں مہینہ جا کے اُسے فرصت ملی اور وہ بھی بڑی منتوں کے ساتھ

مگر پریموتی پر اُس کے آنیکا مطلق اثر نہ ہوا ۔ وہ اُس کے گلے ملکر بھی نہ روئی اُسکے بچے کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا ۔ اسکے دلمیں اب محبّت اور انسانیت نام کو بھی باقی نہ رہی تھی ۔ جیسے گنّے سے رس نکال لو تو صرف فضلہ رہجاتا ہے ۔ اسی طرح جس انسان

کے دل سے محبت نکل گئی تھی۔ گوشت و پوست کا ایک تودہ رہ گیا۔ دیوی دیوتا کا نام زبان پر آتے ہی اسکے تیور بدل جاتے تھے۔ مجگاؤں میں جنم اشٹمی ہوئی۔ لوگ ٹھاکر جی کا برت رکھے ہوئے تھے اور چندے سے ناچ گانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں مگر پریموتی نے عین جنم کے موقع پر اپنے گھر کی مورتی کھیت میں پھنکوا دی۔ ایکادشی برت چھوٹا دیوتاؤں کی پوجا چھوٹی۔ وہ پریموتی اب پریموتی ہی نہ تھی۔

سیوتی نے جوں توں کر کے یہاں دو مہینے کاٹے۔ اسکی طبیعت بہت گھبراتی۔ کوئی سکھی سہیلی بھی نہ تھی جسکے ساتھ بیٹھکر دن کاٹتی۔ برہمن نے تلسا کو اپنی سکھی بنا لیا تھا۔ مگر سیوتی کا مزاج امیرانہ واقع ہوا تھا۔ ایسی عورتوں سے میل جول وہ اپنے لئے باعث ننگ سمجھتی تھی۔ تلسا بیچاری کئی بار آئی مگر جب دیکھا کہ یہ دل کھولکر نہیں ملتی تو آنا جانا چھوڑ دیا۔

تین مہینے گزر چکے تھے۔ ایک روز سیوتی دن چڑھے تک سوتی رہی۔ پران ناتھ نے رات کو بہت رُلایا تھا۔ جب نیند کھلی تو کیا دیکھتی ہے کہ پریموتی اس کے بچے کو گود میں لئے چوم رہی ہے۔ کبھی آنکھوں سے لگاتی ہے اور کبھی چھاتی سے چپٹاتی ہے۔ سامنے انگیٹھی پر ہنڈیا پک رہا ہے۔ بچہ اس کی طرف انگلیوں سے اشارہ کر کے اچکتا ہے کہ کٹورے میں جا بیٹھوں اور گرم گرم حلوا چکھوں۔ آج اس کا چہرہ کنول کی طرح کھلا ہوا ہے شاید اسکی تیز نگاہوں نے تاڑ لیا ہے کہ پریموتی کے اجڑے ہوئے دل میں پریم نے آج پھر باس کیا ہے۔ سیوتی کو یقین نہ آیا۔ چارپائی پر پڑے پڑے نیم باز آنکھوں سے تاک رہی تھی گویا خواب دیکھ رہی ہے۔ اتنے میں پریموتی پیار سے بولی: "بیٹی اٹھو دن چڑھ آیا"۔

سیوتی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور آنکھیں بھر آئیں۔ آج بہت دنوں کے

بعد ماں کے منہ سے محبت کی باتیں سُنیں۔ جھٹ اُٹھ بیٹھی اور ماں کے گلے لپٹ کر رونے لگی۔ پریموتی کی آنکھوں سے بھی آنسو کی جھڑی لگ گئی۔ سُوکھا پیڑ ہرا ہوا۔ جب دونوں کے آنسو تھمے تو پریموتی بولی "سُنو۔ تمہیں آج یہ سب باتیں اچرج معلوم ہوتی ہیں۔ ہاں بیٹی اب اچرج ہی ہیں۔ میں کیسے روتی جب آنکھوں میں آنسو ہی نہیں رہے پیار کہاں سے لاؤں جب کلیجہ سوکھ کے پتھر ہوگیا۔ سب دنوں کے پھیر ہیں۔ آنسو اُن کے ساتھ گئے اور پیار کملا کے ساتھ۔ آج نہ جانے یہ دو بوند کہاں سے نکل آئے۔ بیٹی میری خطائیں سب معاف کرنا۔"

یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ سیوتی زرد ہوگئی۔ ماں کو فرش پر لٹا دیا اُس دن سے پریموتی کا یہ حال ہوگیا جیسے بکھور رو رہی ہے۔ باتیں کرتی تو شکر و قند گھولتی بچے کو گود سے ایک دم کے لئے الگ نہ کرتی۔ مہریوں سے بولتی تو منہ سے پھول جھڑتے پھر پہلے کی پریموتی ہوگئی۔ شیریں زباں۔ رحم دل اور نیک۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل سے ایک پردہ سا اُٹھ گیا۔ جب شدت کی برف پڑتی ہے تو بعض ندیاں یخ بستہ ہو جاتی ہیں۔ تب اُن میں بسنے والی مچھلیاں اور دریائی جانور چادر برف میں چھپ جاتے ہیں کشتیاں پھنس جاتی ہیں اور اس خوش خرام سیمتن جاں نواز چشمہ آب کی صورت بالکل نظر نہیں آتی۔ حالانکہ برف کی چادر کے نیچے وہ خواب ناز میں مست پڑا رہتا ہے مگر جب گرمی کا راج ہوتا ہے تو برف پگھل جاتی ہے اور دریائے سیمتن برف کی چادر اُٹھا دیتا ہے، پھر مچھلیاں اور جانور آ بستے ہیں۔ کشتیوں کے بادبان لہرانے لگتے ہیں اور اس کے ساحل پر مردم و مرغ و مور کا جمگھٹ ہو جاتا ہے۔

مگر یہ کیفیت زیادہ دنوں تک قائم نہ رہی۔ ایک ہی ہفتہ میں پریموتی کی حالت نازک

ہوگئی۔ مزاج کا صحیح ہونا گویا موت کا پروانہ تھا۔ اسی مدہوشی نے اسے ابتک قیدِ حیات میں رکھا تھا۔ ورنہ پریموتی جیسی نرم دل عورت بادِ حوادث کے ایسے جھونکے نہ برداشت کر سکتی۔

سیوتی نے چاروں طرف تار دلوائے کہ آکر اماں کو دیکھ جاؤ۔ مگر کہیں سے کوئی نہ آیا۔ پران ناتھ کو رخصت نہ ملی۔ برجن بیمار تھی۔ رہے مادھا چرن وہ نینی تال سیر کرنے گئے ہوئے تھے۔ پریموتی کو بیٹے ہی کے دیدار کا اشتیاق تھا۔ مگر جب اُن کا خط آگیا کہ میں اس وقت نہیں آسکتا۔ تو اس نے ایک لمبی سانس لی اور آنکھیں موند لیں اور ایسی سوئی کہ پھر اُٹھنا نصیب نہ ہوا۔

نفس کی سرکشیاں

انسان کا دل ایک راز سربستہ ہے کبھی تو وہ لاکھوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا اور کبھی چند پیسوں پر پھسل جاتا ہے کبھی صدہا بے گناہوں کے خون پر اُف تک نہیں کرتا اور کبھی ایک بچے کو روتا دیکھکر رو دیتا ہے۔ پرتاپ چند اور کملا چرن میں اگرچہ برادرانہ محبت نہ تھی مگر کملا کی موت بے ہنگام کا جو صدمہ پرتاپ کو ہونا چاہیے وہ نہ ہوا۔ سُن کر وہ چونک ضرور پڑا اور ذرا دیر کے لئے معلوم بھی نظر آیا مگر وہ ملال جو کسی شخص کو اپنے سچے دوست کی وفات پر ہوتا ہے اُسے نہ ہوا۔ اسمیں شک نہیں کہ شادی سے پہلے ہی سے اس نے برجن کو اپنی بہن سمجھنا شروع کیا تھا۔ تاہم اس خیال میں اسے پوری کامیابی کبھی نہ حاصل ہوئی۔ وقتاً فوقتاً اُسکا وہم اس پاک رشتہ کے حدود سے بہت آگے بڑھ جاتا تھا۔ کملا چرن سے اُسے بذاتِ خود خاص کوئی ایسی محبت نہ تھی۔ اُسکی جو کچھ خاطر و مدارت اور محبت وہ کرتا تھا کچھ تو اس خیال سے کہ برجن سُنکر خوش ہوگی اور کچھ اس خیال سے کہ سوسیلا کی موت کا کفارہ اسی طرح ادا ہو سکتا ہے جب برجن سسرال چلی آئی تو البتہ کچھ دنوں تک پرتاپ نے اُسے اپنے خیالات میں آنے دیا۔ مگر جب وقت سے کہ وہ اُسکی بیماری کی خبر پاکر بنارس گیا تھا اور اسکی ملاقات نے برجن پر دارو ئے شفا کا کام کیا تھا۔ اُسی وقت سے پرتاپ کو یقین ہو گیا تھا کہ برجن کے دل میں کملا نے وہ جگہ نہیں پائی جو میرے لئے مخصوص تھی۔

پرتاپ نے برجن کو نہایت پُر درد ماتم نامہ لکھا مگر خط لکھتا جاتا تھا اور سوچتا جاتا

تھا کہ اس کا اس پر کیا اثر ہوگا. بالعموم ہمدردی محبت کو مضبوط کرتی ہے کیا عجب ہے کہ یہ
خطرہ ہی اپنا کام کر جائے. علاوہ اس کے چونکہ وہ ذرا مذہبیت کی طرف زیادہ مائل تھا. کملا کی
موت نے یہ خیال پیدا کیا کہ ایشور نے میری محبت کی قدر کی اور کملا جن کو میرے راستے سے ہٹا دیا
گویا یہ غیب سے پروانہ ملا ہے کہ اب میں برجن سے اپنی محبت کی داد لوں پرتاپ یہ تو جانتا تھا
کہ برجن سے کسی ایسی بات کی امید کرنا جو اخلاق اور صداقت کے راستے سے جو بھر بھی ہٹی
ہوئی ہو حماقت ہے. مگر اخلاق اور صداقت کے دائرہ میں رہتے ہوئے میری خاطرداری اور
دلدہی اگر ممکن ہے تو برجن زیادہ عرصہ تک میرے ساتھ بیرحمی نہیں کر سکتی - جب میں
آنکھوں میں آنسو بھر کر اور عاجزی سے منت کرونگا تو وہ ضرور میری طرف مخاطب ہو جائیگی
اور وقت محبت اور عاشقانہ خاطرداریاں اپنا اپنا کام پورا کر کے رہینگی -

ایک مہینہ تک یہ خیالات اُسے بیچین کرتے رہے یہانتک کہ برجن سے ایکبار
پوشیدہ ملاقات کرنے کا بیتابانہ اشتیاق اُسے پیدا ہوا - یہ وہ جانتا تھا کہ ابھی برجن کے
دل پر تازہ صدمہ ہے اور میری بات یا انداز سے اگر میرے نفس کی سرکشیوں کی بو نکلی
تو پھر برجن کی نگاہوں سے ہمیشہ کے لئے گر جاؤں گا مگر جیسے کوئی چور روپیہ کا ڈھیر دیکھ
کر صبر نہیں کر سکتا. اسی طرح پرتاپ اسوقت اپنے تئیں تھام نہ سکا. انسان کی قسمت
ایک بڑی حد تک موقعوں کے ہاتھ میں رہتی ہے. موقعے اسے نیک بھی بناتے ہیں اور بد بھی
جب تک کملا چرن زندہ تھا پرتاپ کے نفس کو کبھی اتنا سر اُٹھانے کا موقع نہ ملا. اسکی
موت نے گویا جگہ خالی کر دی - یہ خود غرضی کا نشہ یہانتک بڑھا کہ اُسے ایک روز ایسا محسوس
ہونے لگا کہ برجن مجھے یاد کر رہی ہے. اپنی بیتابی سے وہ برجن کی بیتابی کا اندازہ لگانے
لگا. بنارس چلنے کا ارادہ مصمم کر لیا.

دو بجے رات کا وقت تھا۔ چاروں طرف موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اندھیرے
نے سارے شہر پر ایک گھٹا ٹوپ چادر پھیلا دی تھی۔ کبھی کبھی پیڑوں کی سنسناہٹ سنائی
دیجاتی تھی۔ دھواں مکانوں اور درختوں پر ایک سیاہ غلاف کی طرح لپٹا ہوا تھا اور سڑک
کی لالٹینیں دھوئیں کی سیاہی میں ایسی نظر آتی تھیں جیسے بادل میں چھپے ہوئے تارے۔ پرتاپ
چندر پیلی کوٹھی سے نکلا تو اُس کا دل بالکل اچھل رہا تھا اور ہاتھ پاؤں کانپتے تھے۔
زندگی میں پہلا موقع تھا کہ گناہ کا اُسے تجربہ ہوا۔ افسوس! کہ دل کی یہ کیفیت عرصے تک
قائم نہیں رہتی بلکہ نفس اس منزل دشوار کو طے کر لیتا ہے۔ جس نے کبھی شراب نہیں پی ہے
اُسے اس کی بو سے نفرت ہے۔ شاید پہلی بار وہ پیئے گا تو گھونٹ اُس کا منہ بدمزہ رہیگا اور
وہ تعجب کریگا کہ کیوں لوگ ایسی زہریلی اور کڑوی چیز کے ایسے گرویدہ ہیں مگر جیتے جی
دلوں میں اُسکی نفرت غائب ہو جاتی ہے اور وہ بھی اسی طرح کا غلام ہو جاتا ہے۔ گناہ
کا مزا شراب سے بہت زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

پرتاپ چندر اندھیرے میں آہستہ آہستہ جا رہا تھا۔ اس کے قدم جلد جلد نہیں اُٹھتے
تھے کیونکہ گناہ نے اُس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ اس ولولہ آمیز مسرت کا
جو ایسے موقعوں پر قدموں کو تیز کر دیتی ہے اس کے چہرے پر کوئی نشان نہ تھا۔ وہ چلتے
چلتے رُک جاتا اور پھر کچھ سوچ کر آگے بڑھتا تھا۔ شیطان اُسے گناہ کے غار میں کیسا
کھینچے لئے جاتا ہے۔

پرتاپ کا سر دھم دھم کر رہا تھا اور خوف سے پتلیاں کانپ رہی تھیں۔ سوچتا
بچارتا گھنٹہ بھر میں وہ منشی شیاما چرن کی عالیشان حویلی کے سامنے جا پہنچا۔ آج تاریکی
میں یہ حویلی بہت ہی بھیانک معلوم ہوتی تھی جیسے گناہ کا بھوت سامنے کھڑا ہو۔ پرتاپ

دیوار کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ کسی نے اس کے پیر باندھ دئے۔ آدھ گھنٹہ تک وہ یہی سوچتا رہا کہ لوٹ چلوں یا اندر جاؤں۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو غضب ہو جائیگا۔ برجن مجھے دیکھکر دل میں کیا سوچیگی کہیں ایسا نہ ہو کہ میری یہ حرکت مجھے ہمیشہ کے لئے اُس کی نظروں سے گرا دے مگر ان سب اندیشوں پر شیطان کی کشش غالب آئی۔ نفس کے بس میں ہو کر انسان کو نیک و بد کی تمیز نہیں باقی رہجاتی۔ اُس نے دل کو مضبوط کیا اور اس بزدلی پر اپنے تئیں ملامت کرنے لگا۔ لیجانا اں مکان کے عقب کی طرف جا کر باغیچہ کی چہار دیواری سے اندر پھاند پڑا۔ باغیچہ سے مکان کے اندر جانے کے لئے ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ اتفاق سے وہ اسوقت کھلا ہوا تھا۔ پرتاپ کو اس وقت یہ ایک فالِ نیک سا معلوم ہوا مگر فی الواقع یہ خانۂ معصیت کا دروازہ تھا۔ اندر جاتے ہوئے پرتاپ کے ہاتھ پاؤں تھر تھرانے لگے۔ دل میں ایسی غضب کی دھڑکن تھی کہ معلوم ہوتا تھا وہ سینہ سے باہر نکل پڑیگا۔ اُس کا دم گھٹتا تھا۔ ایمان نے ایکی بہت زور لگایا۔ اپنی ساری قوت صرف کر دی۔ مگر نفس کا زور زبردست تھا اور رک سکا۔ پرتاپ دروازہ کے اندر داخل ہوا اور آنگن میں تلاشی کے چبوترہ کے پاس چوروں کی طرح کھڑا سوچتا رہا کہ برجن سے کیونکر ملاقات ہو۔ مکان کے سب دروازے بند ہیں۔ کیا برجن بھی یہاں سے چلی گئی۔ یکایک ایک سمت ایک بند دروازہ کے دراڑوں سے جلی روشنی کی شعاع دکھلائی دی۔ اسے دیکھتے ہی اُس کے جگر نے ایسی تلخ بھری گویا ہوا میں اڑا جاتا ہے۔ دبے پاؤں اسی طرف چلا۔ اور دراڑ میں آنکھ لگا کر اندر کی کیفیت دیکھنے لگا۔ اُس کی سانس اُس وقت بڑی تیزی سے چل رہی تھی۔

برجن ایک سفید ساڑی پہنے۔ چہرہ زرد۔ بال بکھرے ہوئے۔ فرش پر ہاتھ میں قلم لئے بیٹھی تھی اور دیوار کی طرف دیکھ دیکھکر کاغذ پر کچھ لکھتی جاتی تھی جیسے کوئی شاعر بحر خیال سے

موتی نکل رہا ہو۔ قلم کو دانتوں تلے دبا کر کچھ سوچتی اور لکھتی اور ذرا دیر کے بعد دیوار کی طرف تکنے لگتی۔ پرتاپ بہت دیر تک سانس روکے ہوئے یہ دلچسپ نظارہ دیکھتا رہا۔ نفس اُسے بار بار ٹہوکے دیتا مگر یہ ایمان کا آخری قلعہ تھا۔ اسوقت ایمان کا شکست کھا جانا گویا پہلوئے دل میں شیطان کا جگہ پانا تھا۔ ایمان اور نتائج کے خوف نے اسوقت پرتاپ کو اُس غار میں گرنے سے بچا لیا جہاں سے مرتے دم تک اُسے نکلنا نصیب نہ ہوتا۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ غار معصیت سے بچانیوالا اسوقت ایمان نہ تھا بلکہ نتائج کا خوف اور پشیمانی کا خیال۔ بسا اوقات جب ہمارا ایمان مغلوب ہوجاتا ہے تو نتائج کا خوف ہمکو بدکرداریوں سے بچا لیتا ہے۔ برجن کے چہرہ پر باوجود زردی کے ایک ایسی رونق تھی جو قلب کی صفائی اور خیالات کی بلندی کا پتہ دے رہی تھی۔ اُسکے بشرے کی متانت اور نگاہ کی پاکیزگی میں نفس سرکش کے لئے وہ جانگداز تازیانہ تھا جس سے پرتاپ کے نفس کا جانبر ہونا محال تھا کیونکہ راہ معصیت میں اُس کا یہ پہلا سفر تھا۔ وہ ایسا متاثر ہوا کہ رونے لگا۔ نفس نے جتنے خیالات فاسد اُس کے دل میں پیدا کر دئے تھے وہ سب اس نظارہ نے یوں غائب کر دئے جیسے اُجالا اندھیرے کو دور کر دیتا ہے۔ اسوقت اُسے یہ خواہش ہوئی کہ اس کے پیروں پر گر کر اپنی ان خطاؤں کی معافی مانگ لوں۔ جیسے کسی مہاتما سنیاسی کے روبرو جا کر ہمارے دل کی کیفیت ہوجاتی ہے اسی طرح پرتاپ کے دل میں خود بخود عز و احترام کے خیالات پیدا ہوئے۔ وہ اپنی اخلاقی پستی پر ایسا نادم ہوا کہ برجن کے سامنے جانے کی ہمت نہ پڑی۔ شیطان یہانتک لایا مگر آگے نہ لیجا سکا۔ وہ اُلٹے قدم لوٹا اور ایسی تیزی سے باغیچہ میں آیا اور چہار دیواری سے باہر کودا گویا کوئی اُسکے تعاقب میں ہے۔

صبح کا ذب کا وقت ہو گیا۔ پرتاپ کے ایمان کی طرح آسمان میں تارے جھلملا رہے تھے اور

اور بچوں کی گھر گھر آواز کانوں میں آتی تھی۔ پرتاپ پر دباتا۔ آدمیوں کی نظریں بچاتا گنگا جی کی طرف چلا۔ یکایک اُس نے سر پر ہاتھ رکھا تو ٹوپی کا پتہ نہ تھا اور نہ جیب میں گھڑی دکھائی دی۔ اُس کا کلیجہ سُن سے ہو گیا اور دل سے بے اختیار ایک آہ نکل آئی۔

بعض اوقات ہماری زندگی میں ایسے واقعات ہو جاتے ہیں جو دم زدن میں اُس کی صورت پلٹ دیتے ہیں کبھی والدین کی ترچھی نگاہ بیٹے کو نیکنامی کے ساتویں آسمان پر پہنچا دیتی ہے اور کبھی بیوی کی ایک نصیحت شوہر کو مہاتما رشی بنا دیتی ہے غیرتمند ہستیاں اپنے یگانوں کی نگاہوں میں ذلیل ہو کر دُنیا کا بوجھ بننا نہیں برداشت کر سکتیں۔ انسانی زندگی میں ایسے موقعے زیادہ ہوتے ہیں پرتاپ چندر کی زندگی میں بھی وہ مبارک ساعت تھا جب وہ پچھوار گلیوں میں ہوتا ہوا گنگا کے کنارے آ کر بیٹھا اور افسوس و ندامت کے آنسو بہانے لگا۔ نفس کی حوصلہ انگیزیاں اسے ذلیل و خوار کرنے میں کوئی کسر نہ رکھی تھی مگر اُس کے لئے یہ تازیانہ اُستاد مہربان کا تازیانہ ثابت ہوا کیا یہ تجربہ نہیں کہ زہر بھی بعض اوقات آب حیات کا کام دیتا ہے

جس طرح ہوا کا جھونکا سُلگتی ہوئی آگ کو دہکا دیتا ہے اسی طرح اکثر دلوں میں دبے ہوئے جوش کو متحرک کرنے کیلئے کسی ظاہری تحریک کی ضرورت ہوتی ہے اپنی مصیبت کا تجربہ اور دوسروں کی مصیبت کا نظارہ بسا اوقات دل میں وہ آگ پیدا کر دیتا ہے جو صحبت مطالعہ اور خلقی مناسبت کے اثر سے بھی ممکن نہ تھا۔ اگرچہ پرتاپ چندر کے دل میں نیک اور بےغرض زندگی بسر کرنیکا خیال پہلے ہی سے تھا مگر نفس کے اس تازیانہ نے وہ منزل ایک ہی لمحہ میں طے کر دی جسکے طے ہونے میں برسوں لگتے۔ اُسکی زندگی کا ارادہ مستقل ہو گیا معمولی صُورتوں میں قومی خدمت اُسکی زندگی کا ایک دلچسپ شغل غالباً ضروری مشغلہ ہوتی مگر ان واقعات نے قومی خدمت کو اُسکی زندگی کی غرض و غایت بنا دیا۔ سُباما کی دلی آرزو پُوری ہونے کے سامان پیدا ہو گئے۔ کیا ان واقعات کی تہ میں کوئی غیبی طاقت متحرک تھی۔ کون کہہ سکتا ہے۔

ہردوار سے بہت دُور شمال کی طرف بیجلار پہاڑوں میں ایک چشمے کے کنارے ایک نوجوان بیٹھا ہوا نظر آتا تھا۔ جگہ بہت خوفناک تھی۔ درندے دن دہاڑے چہل قدمیاں کرتے تھے مگر یہ شخص شب و روز ایک ہی چٹان پر بیٹھا رہتا۔ وہ جگر کا بہت مضبوط تھا اس کے چہرے سے وحشت برستی تھی۔ کپڑے پھٹ پھٹ کر تار تار ہو گئے تھے۔ بال بڑھ آئے تھے مگر ظاہرا ان باتوں کی اُسے مطلق پروا نہ تھی۔ اُسکے پاس نہ اوڑھنا تھا نہ بستر۔ نہ برتن نہ کھانا۔ کبھی کبھی وہ جنگلی پھل کھا لیا کرتا تھا۔ ایسا بے سر و سامان آدمی کس نے دیکھا ہوگا۔ یہ پرتاپ چند تھا۔

پرتاپ چند کو یوں بسر کرتے کئی مہینے گزر گئے ہیں وہ اپنے نفس سے لڑ رہا ہے مگر فتح نہیں ہوتی۔ اُس نے دشمن کو جیسا حقیر سمجھا تھا اُس سے بدرجہا طاقتور پایا جس وقت تک وہ الہ آباد میں تھا ذاتی عیش اور تنعم کے خیالات اُسکے دل میں نام کو بھی نہ آتے تھے مگر اس ویرانے میں اس کا خیال بار بار انہیں باتوں کی طرف جھکتا۔ وہ خیالات کے مجتمع کرنے میں کامیاب نہ ہوتا۔ اکثر ایک نازنین کی تصویر اُسکی نگاہوں کے سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی جو برجن سے بہت مشابہ تھی۔ تخیل ایک عالیشان مکان بنواتا۔ اُسے آلاتِ نشاط و لوازم سے سجاتا۔ جان بخش نغموں کی میٹھی اللاپ کانوں میں آنے لگتی عاشقانہ چھیڑ چھاڑ اور معشوقانہ شرارتوں کے دور چلنے لگتے گھنٹوں اسی پر سرور خواب کے مزے اُٹھاتا پھر یکا یک وہ چونک پڑتا کہ میں کیا بیہودہ باتیں سوچ رہا ہوں اور خیالات کو پھر سے مٹا کر مسئلہ پیش نظر پر جماتا مگر تھوڑی دیر کی شیریں نوائیاں اور غزالوں کی

کلیلیں خیالات کے قدم میں زنجیر گرانبار کا کام کرتیں یہانتک کہ وہ مایوس ہو کر اُٹھ کھڑا ہوتا اور دلمیں کہتا کہ میری زندگی یوں ہی خواب دیکھنے میں گزریگی۔

رفتہ رفتہ اُس کی یہ حالت ہو گئی کہ کھانے پینے کی مطلق سُدھ نہ رہتی۔ سویرے سے شام تک دیوانہ وار بیٹھا ہوا درختوں کی شاخوں اور پتھر کی چٹانوں سے نظریں ملایا کرتا۔ خیال کی طاقت بڑی زبردست ہے۔ قومی خدمت کے خیال میں غرق رہتے رہتے اُس کے دل میں درد کا سچا جذبہ پیدا ہوا جسکے بغیر بیغرض خدمت محال ہے کبھی بوڑھے ضعیف کو لکڑیاں توڑتے دیکھتا تو خود اُسکی لکڑیاں توڑ کر اُسکے گھر تک پہنچا آتا۔ بھولے بھٹکے مسافروں کے ساتھ لیکر آبادی تک جاتا۔ ان کاموں میں اُسے روحانی مسرت حاصل ہوتی یہانتک کہ آس پاس کی آبادیوں میں ان نیک کاموں کا شہرہ ہو گیا لوگ سمجھنے لگے کہ کوئی مہاتما رشی ہیں۔ عورتیں آتیں کہ مجھے سال بھر سے لڑکا نہیں ہوا۔ کوئی دعا تعویذ دیجئے۔ مرد آ کر کہتے کہ میرے روزگار کی فکر کر دیجیے۔ آخر پرتاپ چند یہاں سے گھبرا کر بھاگا اور دشوار گزار گھاٹیوں کو چیرتا ہوا بہت دور نکل گیا۔ یہاں ایک اونچی چوٹی پر ایک چھوٹی سی منڈھیا تھی۔ اُسی کے قریب ایک چٹان پر اُس نے بھی اپنا آسن جمایا۔

یہاں رہتے اُسے چھ مہینے گزر گئے اور اب اُسے اپنے دلمیں ایک باطنی طاقت محسوس ہونے لگی۔ جذب خیال کی قوت پیدا ہو گئی مگر اُسکی آتما ابھی تک کمزور تھی اس کا ثبوت بھی اُسے جلد مل گیا ایک روز شام کے وقت وہ بیٹھا ہوا تھا کہ یکایک شیر کی ہولناک گرج اس کے کانوں میں آئی۔ آواز سنتے ہی اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور دل دھڑکنے لگا۔ مگر وہ سنبھل بیٹھا اور ادھر ادھر چوکنی نگاہوں سے تاکنے لگا کہ آواز کدھر سے آئی ہے۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک خونخوار شیر چشمہ کے کنارے ایک بے بس ہرن پر ٹوٹ پڑا ہے اور اپنے آہنی جبڑے اُسکے گردن

میں چھپا رہا ہے۔ اُسکی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ یہ ہیبناک نظارہ دیکھتے ہی پرتاپ چند کا پسینہ چھوٹ گیا۔ وہ بے اختیاری طور پر اُٹھا کہ مندر میں جا چھپوں مگر اسی اثنا میں ایک لالہ غر اندام شخص جسکی ریش دراز ناف تک آئی ہوئی تھی اور چہرہ بدر کامل کی طرح منور تھا۔ ہاتھ میں ایک سنگترہ سا لئے ہوئے نکلا اور دلیرانہ قدم بڑھاتا ہوا شیر کے سر پر جا پہنچا۔ شیر جھلایا تو تھا ہی شعلہ بار آنکھوں سے گھورتا ہوا دوڑا مگر نزدیک پہنچتے ہی اُس کی آنکھیں جھپک گئیں اور ایک خطاوار شخص کی طرح جو اپنے آقا سے معافی کا طالب ہو زمین پر لیٹ گیا۔ بابا جی نے آہستہ سے مہمان کو آغوش میں اُٹھا لیا اور مندر میں لا کر مرگ چھالے پر لٹا دیا۔ چند بوٹیاں پتھر پر گھس کر اُسکے زخموں پر لگائیں اور تب اپنی کہنی کو جس پر تازہ گلہائے خون زیب دے رہے تھے دھونے کے لئے چشمے کی طرف چلے۔ جیسے کوئی شیودکا پوجاری کمل کے پھولوں کو جل دان کے لئے لیجاتا ہو۔ پرتاپ اس حیرت انگیز روحانی کرشمہ سے اتنا متاثر ہوا کہ کچھ دیر تک نقش دیوار کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر سوچنے لگا افسوس! کیا میری آتما اتنی کمزور ہے کیا مجھے اپنی جان اتنی پیاری ہے!

پرتاپ چند اپنی اس بزدلی پر ایسا جھنجھلایا کہ آنکھیں سُرخ ہو گئیں خون جوش کھانے لگا۔ ایک مضبوط لکڑی کا کندہ اُٹھا کر کسی بدمست شرابی کی طرح لڑکھڑاتی ٹانگوں سے دوڑتا ہوا شیر کے کلے پر جا پہنچا۔ شیر نے اُسے دیکھا اور دیکھتے ہی اُس کے تیور بدل گئے۔ بادل کی طرح گرجا اور قریب تھا کہ جست مار کر پرتاپ کی گردن دبوچے کہ اتنے میں اس نے لکڑی کا کندہ اپنی پوری طاقت سے اُس کے سر پر ٹیک دیا۔ مگر شیر کے فولادی سر پر اسکا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ وہ اور بھی جھلایا اور اس زور سے گرجا کہ جنگل کے تمام جانور اپنے اپنے کمین گاہوں سے نکل پڑے اور دونوں اگلے پنجے اُسکی کمر میں ڈالدئے۔ دفعتاً اُس کے

سر پر گنڈاسے کا بھرپور ہاتھ پڑا بلبلیش کھا کر پیچھے کی طرف دیکھا تو سادھو بابا کھڑے ہیں
اس نے فوراً پرتاپ کو چھوڑ دیا اور درد سے کراہتا بھاگا۔

پرتاپ چند نے ان بابا جی کو اکثر مندر سے آتے جاتے دیکھا تھا مگر اس وقت جو
اس نزدیک سے اُن کے پر جلال چہرہ پر نگاہ ڈالی تو صورت کچھ مانوس معلوم ہوئی۔ سوچنے
لگا کہ میں نے انہیں دیکھا ہے مگر حافظہ نے یاری نہ دی۔ ندامت سے سر جھکا کر بولا: "میں
نے آپ کو کہیں اور دیکھا ہے"؟

سادھو جی نے مسکرا کر فرمایا "یہ کیوں نہیں کہتے کہ برسوں آپکی گود میں کھیلا ہوں"
اتنا سنتے ہی پرتاپ کی آنکھوں سے پردہ سا ہٹ گیا۔ کلیجہ نے جست ماری اور
لبوں تک آ پہنچا۔ ایک پُرجوش فرزندانہ بیخودی کے ساتھ اُن کے سینے سے لپٹ گیا اور
آنکھوں سے آنسو کے قطرے گرنے لگے۔ منشی سجیون لال نے پدرانہ شفقت سے اس
کے سر پر ہاتھ پھیرا اور آنسو پونچھے ؎

تیاری

جیسے کوئی منجدھار میں پڑی کشتی طوفان کے تھپیڑوں اور تلاطم کے جھکولوں سے اپنی جان بچاکر کسی بندرگاہ کے آغوش میں جا پہنچتی ہے۔ اسی طرح پرتاپ چند اب ایک ایسے مسکن میں آگیا تھا۔ جہاں اُس کے دماغ کو اطمینان تھا اور دل کو قرار۔ وہ اب اُس بھٹکے ہوئے مسافر کی طرح نہ تھا جو اندھیری رات میں ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہو۔ اب اُسے اپنا راستہ اُس کے نشیب و فراز اور منزلِ مقصود صاف نظر آتے تھے۔ منشی سجیون لال کی صحبت اور تلقین نے چند ہی مہینوں میں اُس کے دل سے وہ کمزوریاں محو کردیں جنہیں وہ سخت کوششوں کے بعد بھی دور کرنے میں پورے طور پر کامیاب نہ ہوا تھا۔ ایک عارف کامل کی چند روزہ صحبت تزکیۂ نفس کے لئے برسوں کی اندرونی کشمکش اور مطالعہ سے بدرجہا زیادہ مفید ہوتی ہے منشی جی اُسے ہر روز بھگوت گیتا پڑھاتے۔ اُنہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسی بحرِ عمیق کی غواصی میں صرف کیا تھا اور ادھر تین چار سال تک کتنے ہی یوگیوں اور سنیاسیوں کے خرمنِ دانش سے خوشہ چینی کی تھی۔ وہ ایک ایک نکتہ کی ایسی تشریح کرتے۔ اُنکا لہجہ ایسا دلکش اور طرزِ بیان ایسا سرور انگیز تھا کہ پرتاپ پر خود فراموشی کا عالم طاری ہو جاتا۔ اُن کے ایک ایک لفظ میں وہ اثر ہوتا تھا جو کسی خانقاہ روحانیت کے بسنے والے ہی کی باتوں میں ہوسکتا ہے۔ پرتاپ چند کے خیالات روز بروز زیادہ پاک۔ زیادہ بیغرض اور حوصلے زیادہ وسیع اور زیادہ بلند ہوتے جاتے تھے۔ اُس نے یوگ کی مشق بھی شروع کردی تھی چونکہ

جوں اس میدان میں وہ قدم آگے بڑھاتا تھا۔ اُسکی ہمدردیاں زیادہ وسیع اور عام ہوتی جاتی تھیں۔

اس طرح دو سال گزر گئے۔ پرتاپ چند کے قوائے جسمانی شیروں کی طرح مضبوط اور تنومند ہو گئے۔ اونچی سے اونچی پہاڑیوں پر بے تکان چڑھ جاتا۔ منزلوں کی مسافت طے کر کے یوں آ بیٹھتا گویا کسی باغ کی سیر کر کے لوٹا ہے۔ قوتِ برداشت اتنی مضبوط ہو گئی تھی کہ برفستانی چوٹیوں پر سنگین چٹانوں کا بستر بنا کر ایسے آرام سے لیٹتا گویا آراستہ مکان میں مخملی گدوں پر لیٹا ہوا ہے۔ اس کا چہرہ ایسا روشن ہو گیا تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں جھپک جاتی تھیں۔ اُس پر شانوں تک بکھرے ہوئے بال اور درد سے بھری ہوئی آنکھیں اُسے رحم کی مورت بنائے دیتی تھیں۔ روشن رخساروں پر سبزۂ نودمیدہ ایسے معلوم ہوتے تھے گویا پروانے شمع پر نثار ہو رہے ہیں۔ کیسا حسنِ مردانہ تھا کہ پہلی ہی نظر میں اُس کی تصویر پردۂ دل پر ہمیشہ کیلئے کھنچ جاتی تھی۔ یقیناً جب وہ اپنا آسن بچھا کر یوگ سادھن کرتا ہوگا تو کیلاش کی بسنے والی اپسرائیں اس پر نثار ہوتی ہونگی۔ جس وقت وہ جڑی بوٹیوں کا بقچہ لیکر قدم بڑھاتا ہوا چلتا تو پہاڑوں کے بسنے والے مرد اور عورتیں اضطراری طور پر اس کے روبرو سر جھکاتے اور جس وقت تک جھاڑیاں اور چٹانیں اُسے اپنے دامنوں میں چھپا لیتیں اُسکی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھا کرتے۔ اُس کے علاج میں وہ تاثیر تھی۔ باتوں میں وہ مٹھاس اور آنکھوں میں وہ جادو کہ گرد و نواح کے لوگ سمجھتے وہ دیولوک کا کوئی ایلچی ہے۔

ایک دن سجیون لال نے پرتاپ چند سے کہا "بالانند چلو آج تمہیں اُتر کے مقامات کی سیر کراؤں۔ اس پاک سرزمین میں کتنے ہی سنیاسی اور رشی دنیا سے منہ موڑ کر بھگوت بھجن کر رہے ہیں میں نے ایکبار سب کے درشن کر لئے ہیں مگر اب پھر اُن کے درشنوں کیلئے جی بے چین ہو رہا ہے۔"

پرتاپ۔ میں بسر و چشم حاضر ہوں۔ یہاں سے کس طرف کا قصد ہے؟

سجیون لال۔ پہلے سنت دھام کو چلینگے۔ وہاں کئی مہاتماؤں کے درشن ہونگے۔ وہاں سے پورب کی

طرف کیلاش ہے۔ کیلاش سے سیدھے گیان سروور کی طرف سدھاریں گے۔ ایسا دلکش مقام بردۂ زمین پر اور کہیں نہ ہوگا۔ عین ساگر کے کنارے شری برہما نند جی کا دھام ہے۔ اُنکے قدموں پر سر جھکا ئیں گے۔ مجھے کتنے ہی رشیوں سے فیضِ محبت کا موقع رہے مگر برہما نند جی تاروں میں چاند ہیں۔ تمہیں دیکھکر وہ بہت خوش ہونگے۔

پرتاپ چند نے روانگی کی تیاری کرنی شروع کی اور تیاری ہی کیا تھی۔ مرگ چھالے جڑی بوٹیوں کا بقچہ اور چند کتابیں اس مسکن کی ساری کائنات تھی۔ انہیں اس نے بغل میں دبایا اور دونوں آدمی چل کھڑے ہوئے۔ مگر ابھی یہ پہاڑی سے اُترے بھی نہ تھے کہ جنگلی جانوروں کے غول کے غول چیختے چلاتے اُچھلتے کودتے نظر آئے۔ ہرن۔ بکریاں۔ ریچھ۔ شیر چیتے سب کے سب پہلو بہ پہلو بھاگے چلے آتے تھے۔ گویا ہر ایک اپنی دھن میں ایسا مست تھا کہ اُسے دوسروں کی خبر نہ تھی۔ آن کی آن میں ان جانوروں نے دونوں بھگوتوں کے گرد حلقہ باندھ لیا۔ کوئی اُن کے ہاتھ چاٹنے لگا۔ کوئی پیروں پر سر رگڑنے لگا۔ کوئی دردناک آواز میں چیخ رہا تھا۔ کوئی اکڑوں بیٹھا ہوا زمین کی طرف تاک رہا تھا۔ گویا اپنے محسن کی جدائی کا صدمہ اظہار کی قابلیت سے بہت زیادہ دلدوز تھا۔ بے زبانوں کے دل میں بھی وہی جذبۂ محبت اور وہی صدمۂ فراق ہوتا ہے جو حضرت انسان کی زندگی کو تلخ کر دیا کرتا ہے اگرچہ اس کا اظہار صرف اُنہیں لوگوں کے روبرو ہوتا ہے جن کی اندرونی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور جن کی آتمائیں اس قدر وسیع ہیں کہ جسم ظاہری کی تنگیاں اُن کا احاطہ نہیں کر سکتیں اس کوہستان کے ایک ایک ذی روح سے ان دونوں آدمیوں کو سچی ہمدردی تھی۔ اُن کا مسکن ان بے زبانوں کی خوش فعلیوں کا اکھاڑا تھا اور اُن کے ننھے ننھے خوبصورت بچوں کے سونے کا گہوارہ اور کلیلیں کرنے کا میدان۔ اس پرسحر حلقہ میں آ کر انکی باہمی رنجشیں اور کدورتیں مٹ جایا کرتی تھیں۔

شام ہوگئی تھی اور دونوں آدمی مردانہ وار قدم بڑھاتے چلے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا اس کوہستان کے ایک ایک گوشہ کا نقشہ اُنکی نگاہ میں کھنچا ہوا ہے۔ نہ اُنکے قدم پھسلتے تھے نہ ڈگمگاتے تھے۔ تیرہ و تار وادیاں جہاں شاید کسی ذی روح نے قدم نہ رکھا ہو اور عمودی چوٹیاں جنکی بلندی کو پرندے بھی نگاہ حسرت سے دیکھیں۔ اُن کے لئے ایسے آسان اور سہل گزار راستے تھے۔ جیسے کوئی صاف ستھری سڑک۔ یا کسی باغ کی روش۔ اُنکے دل مردوں کے دل تھے اور اعضا شیروں کے۔ پرتاپ کا تو خیر عنفوان شباب تھا مگر منشی جی بھی باوجود پیرانہ سالی کے ایک چٹان سے دوسری چٹان پر بے دھڑک کود جاتے اور پُرشور کوہستانی نالوں میں بے محابا گھس پڑتے۔ گویا ان موانعات ظاہری کی اُنکی نگاہوں میں کوئی وقعت نہ تھی۔

اس طرح بادہ پیمائی میں کئی مہینے لگے۔ دن بھر راستہ چلتے اقامت کے وقت کسی مہاتما رشی کے استھان پر ٹھہر جاتے اور اُس کے ست سنگ سے فیضیاب ہوتے۔ پرتاپ چندکو اکثر یہ خیال گزرتا کہ اگر یہ فقراء قدسی صفات کی خدمت کی طرف متوجہ ہوتے تو مکر و فریب۔ جور و جبر کا نشان مٹا دیتے۔ کیسے روشن دل لوگ تھے! کیسے مستغنی! دولت و شہرت۔ ثروت و جاہ۔ نام و نمود اور دوسری دنیاوی نعمتیں جو حضرت انسان کی زندگی کا معراج خیال کی جاتی ہیں اُنکی نگاہوں میں محض سنگریزے تھے جو حقیقت کے موتی اور گیان و معرفت کے لعل و جواہر کے مقابلے میں ہیچ تھے۔

رفتہ رفتہ وہ کشمیر کے نواح میں آ پہنچے آہ! کیسا سہانا منظر تھا اسے دلکش کہنا اس کی مذمت کرنا ہے۔ اگر دنیا میں کوئی جگہ ایسی ہی ہے جسے اُسکی آنکھ کہہ سکیں تو وہ ہمالہ ہے اور یہ جگہ اس آنکھ کی پتلی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جسے پرانوں میں دیولوک کا مقدس نام دیا گیا ہے۔ یہاں گندھرب اور اپسرائیں بستی ہیں اور انسان کے بہشتی نغموں کی دلآویز

صدا شوق کے کانوں میں آتی ہے۔ پرتاپ پر اس منظر نے خود مستی کی کیفیت طاری کر
دی۔ نگاہیں جدھر جاتیں اُدھر سے ہٹنے کا نام نہ لیتیں۔ روح اور قلب پر ایک تعریف
آمیز رعب چھا رہا تھا۔ کوئی کیسا ہی بے اعتقاد شخص کیوں نہ ہو۔ مگر اس پاک سرزمین
میں داخل ہوتے ہی اُسکی روح پر وہ سرور ہوگا جو اسے مدت العمر یاد رہیگا۔ یہاں کی ہوا
میں سانس لینا اور یہاں کی زمین پر قدم رکھنا جام روحانیت سے شاد کام ہونا ہے دونوں
طرف جہاں تک نگاہ جاتی ہے سر بہ فلک پہاڑیوں کا سلسلہ چلا جاتا ہے۔ ایک کے اوپر
ایک۔ ایک دلپذیر بیقاعدگی کے ساتھ لدی ہوئی ہیں۔ گویا آسمان پر منڈلانے والے بادل
یہاں سیر کرنے کے لئے اُتر آئے ہیں اُنکی چوٹیوں پر جابجا برف کے تودے پڑے ہوئے
ہیں جنہیں آفتاب کی آخری شعاعوں نے زرنگار بنا دیا ہے جیسے اتنی بلندی پر
روحانی شہنشہی کے لئے سنہرے تخت سجائے گئے ہوں۔ انہیں پہاڑیوں کے بیچ میں
گیان سرور آہستہ آہستہ موجیں مار رہا ہے۔ گیان کی طرح اتھاہ اور اپار۔ اُس میں ہنس
بطے اور بگلے خوش فعلیاں کر رہے ہیں۔ گویا آسمان پر تارے نکلے ہوئے ہیں۔
یکایک منشی سجیون لال نے کہا "بالا جی دیکھو جھیل کے کنارے وہ چھوٹی سی
کٹی جو نظر آ رہی ہے وہی برہمانند جی کا استھان ہے"۔ یہ سنتے ہی اشتیاق نے پرتاپ
چند کے قدم اور بھی تیز کر دئے۔ ذرا دیر میں دونوں آدمی کٹی کے دروازے پر پہنچ گئے۔ تو
کیا دیکھتے ہیں کہ سوامی برہمانند جی جھیل کے کنارے ایک چٹان پر بیٹھے ہوئے سندھیا
کرنے میں مصروف ہیں۔ اُنکا چہرہ ایسا پر جلال ہے۔ گویا آفتاب ابھی ابھی گیان سرور
کے آغوش سے نکل آیا ہے۔

*

---- * ----

برجن شاعرہ ہو گئی

جب سے منشی سجیون لال تیرتھ جاترا کو نکلے اور پرتاپ چند الہ آباد چلا گیا اس وقت سے سُباما کی زندگی کی روش بالکل تبدیل ہو گئی تھی اُس نے ٹھیکہ کے کاروبار کو ترقی دینا شروع کیا تو اُسے نہایت وسیع پیمانے پر پہنچا دیا۔ مستری جی بدستور دیانت اور ہوشیاری سے اپنا کام کرتے تھے۔ منشی سجیون لال کے زمانے میں بھی کاروبار کو اتنا فروغ نہ حاصل ہوا تھا۔ سُباما رات کی دن بیٹھے اینٹ پتھر سے سر مارا کرتی تھی اور سُرخی چُونے کے فکر میں پریشان رہتی۔ پائی پائی کا حساب جانچتی اور کبھی کبھی خود مزدوروں کے کام کی دیکھ بھال کرتی۔ ان کاموں میں اُسے ایسا انہماک ہوا کہ دان اور برت سے جو اُس کے پہلے شغل تھے کسی قدر لاپروائی ظاہر ہونے لگی باوجود روز افزوں آمدنی کے سُباما نے خرچ کی کوئی مد زیادہ نہ ہونے دی۔ کوڑی کوڑی دانتوں سے پکڑتی اور یہ سب اس لئے کہ پرتاپ چند صاحبِ مال ہو جائے اور اپنی زندگی بھر فارغ البال و خوشحال رہے۔

سُباما کو اپنے ہونہار بیٹے پر ناز تھا۔ اسکی زندگی کی رفتار دیکھ دیکھ کر اسے یقین ہو گیا تھا کہ جو آرزو دل میں رکھ کر میں نے اولاد مانگی تھی وہ آرزو ضرور پوری ہو گی۔ وہ کالج کے پرنسپل اور پروفیسروں سے پرتاپ کا حال خفیہ طور پر دریافت کرتی تھی اور اُنکی رپورٹوں کا مطالعہ اس کے لئے ایک دلچسپ فسانہ تھا۔ ایسی صورت میں الہ آباد سے پرتاپ چند کے لاپتہ ہو جانے کا تار پہنچنا گویا اُس کے دماغ پر بجلی کا گرنا تھا۔ سُباما نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور سر تھام کر بیٹھ گئی۔ تیسرے دن پرتاپ چند کی کتابیں۔ کپڑے اور دوسرے

اسباب بھی آ پہنچے۔ یہ زخم ہرا ہو چکا تھا۔

ایک دن وہ پرتاپ چند کی کتابیں اُلٹ پلٹ رہی تھی کہ اُسے ایک ریشمی رومال میں بہت سے خطوط حفاظت سے لپیٹے ہوئے دکھائی دئے۔ یہ برجن کے خطوط تھے سُباما انہیں پڑھنے لگی اور ایک ایک کرکے سارا دفتر ختم کر ڈالا۔ آج وہ بہت روئی دوسرے دن جب برجن نے خبر سُنی تو وہ گھبرائی ہوئی سُباما کے یہاں آئی۔ سُباما نے چٹھیوں کا ایک پلندہ اُس کے سامنے پھینک دیا اور منہ پھیر لیا۔ برجن کا چہرہ سرخ ہوگیا وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی اور پُرغرور لہجہ میں بولی: "چچی۔ اس بدگمانی پر آپ بہت پچھتائیں گی"۔ یہ کہہ کر وہ اُلٹے قدم اپنے گھر لوٹ آئی۔

پریموتی کے مرنے کی خبر پاتے ہی پران ناتھ پٹنہ سے اور رادھا چرن نینی تال سے روانہ ہوئے۔ اس کے جیتے جی آتے تو ملاقات ہوتی۔ مرنے پر آئے تو مٹی دیکھنی بھی نہ نصیب ہوئی۔ مرتک سنسکار سب بڑی دھوم سے ادا کئے گئے۔ دو ہفتہ گاؤں میں خوب چہل پہل رہی۔ اس کے بعد رادھا چرن مرادآباد چلے گئے اور پران ناتھ نے پٹنہ چلنے کی تیاری شروع کی۔ اُن کا ارادہ تھا کہ بیوی کو الہ آباد پہنچاتے ہوئے پٹنہ جائیں مگر سیوتی نے ضد کی کہ جب یہاں تک آئے ہیں تو برجن کے پاس بھی ضرور چلنا چاہیئے ورنہ اُسے صدمہ ہوگا۔ سمجھے گی کہ مجھے بیکس سمجھ کر ان لوگوں نے بھی تیاگ دیا۔ للو نے بہت حیلہ و حجت کی کہ مجھ سے جواب طلب ہو جائیگا معطل ہو جاؤنگا۔ کیا عجب ہے کہ تنزلی کی بھی نوبت آجائے۔ آخر سیوتی نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر اُن کی طرف اس نوکھی نگاہ سے دیکھا جسمیں مایوسی بھی تھی اور محبت بھی۔ ضد بھی تھی اور رضا بھی۔ للو اس نگاہ سحر کار کی تاب نہ لا سکے۔ رضا نے وہ کام کر دکھایا جو ضد سے مشکل تھا۔ بیوی کے گلِ عارض کا بوسہ لیکر بولے: "رو دیں کیوں؟"

سیوتی۔ تم رلانے لگے ہی ہو۔

پران۔ اچھا تمہارا ہی کہنا کریں گے۔ لو اب خوش ہو جاؤ

للو مدہوش ہو گیا۔ اس نگاہ میں خموں کا نشہ تھا۔ اسی نگاہ نے گھر تباہ کر دئے ہیں بگولے خنجر چلا دئے ہیں سلطنتیں مٹا دی ہیں۔ للو نے تو کوئی غیر معمولی کام نہیں کیا صرف ایک معزز عہدے سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ایک ننھی سی آنکھ میں کتنی طاقت ہے!

سیوتی کا اس خانہ ویران میں آنا گویا پھولوں میں مہک کا آنا تھا۔ ہفتہ بھر کے لئے اچھے دنوں کی بو باس آ گئی۔ برجن بہت خوش ہوئی اور خوب روئی۔ مادھوی نے منو کو گود میں لیکر خوب سا پیار کیا۔ مردانے کمرے مہینوں سے بند تھے۔ آج انکی قسمتیں بھی کھلیں۔ اجڑا ہوا آشیانہ بسا

سیوتی کے چلے جانے کے بعد برجن اس گھر میں اکیلی رہ گئی تھی۔ صرف مادھوی اس کی انیس و غمخوار تھی۔ اس تنہائی۔ سوز جگر اور درد دل نے اس کا وہ ذاتی جوہر کھول دیا جو اب تک چھپا ہوا تھا اور جس نے اس کے نام کو زندہ جاوید بنا دیا۔ وہ شعر و سخن میں طبع آزمائی کرنے لگی۔ شاعری سچے جذبات کی تصویر ہے اور سچے جذبات خواہ وہ درد کے ہوں یا مسرت کے اسوقت دل میں پیدا ہوتے ہیں جب ہم درد یا مسرت کا مزا چکھتے ہیں اور جذبات کے پیدا ہونے کے بعد ان کا زبان قلم تک آنا تو ایک آسان بات ہے۔ برجن ان دنوں رات کی رات بیٹھے بھاشا میں اپنے خیال کے موتی پرویا کرتی۔ اس کا ایک ایک لفظ سوز اور بیراگ کا ایک ایک دفتر ہوتا تھا۔ دوسرے شاعروں کے دل میں دوستوں کی واہ وا اور سخن سنجوں کی سبحان اللہ سے ولولے پیدا ہوتے ہیں مگر برجن اپنی داستان غم اپنے ہی دل کو سناتی تھی۔ اس کے بلند خیالوں کی داد دینے

شمع خاموش تھی اور سمندِ فکر کو تازیانہ لگانے والی بیکسی

سیوتی کو آئے دو تین دن گزرے تھے۔ ایک دن اس نے برجن سے کہا "میں تمہیں اکثر کسی گہرے خیال میں ڈوبا ہوا پاتی ہوں اور کچھ لکھتے بھی دیکھتی ہوں۔ مجھ سے نہ بتاؤ گی؟" برجن شرما گئی۔ بہانہ کرنے لگی کہ کچھ نہیں۔ یوں ہی جی کچھ کھویا سا رہتا ہے سیوتی نے کہا میں نہ مانوں گی۔ یہ کہہ کر وہ برجن کا صندوقچہ اٹھا لائی جس میں شاعری کے آبدار موتی رکھے ہوئے تھے۔ مجبور ہو کر برجن نے اسے اپنی تازہ نظم سنانی شروع کی منہ سے پہلے مصرعہ کا نکلنا تھا کہ سیوتی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور جب تک ساری نظم نہ ختم ہوئی وہ نقش حیرت بنی بیٹھی رہی۔ پران ناتھ کی صحبت نے اس میں سخن فہمی کا مادہ پیدا کر دیا تھا۔ ہر تازہ مصرعہ سے اس کے گوشۂ جگر میں ایک کسک سی ہوتی تھی اور آنکھیں بھر بھر آتی تھیں۔ جب برجن خاموش ہوئی تو ایک سماں بندھا ہوا تھا۔ جیسے کوئی دلکش نغمہ بند ہو گیا ہو۔ سیوتی نے برجن کو گلے لگا لیا اور دوڑی ہوئی للو کے پاس گئی۔ جیسے کوئی بچہ نیا کھلونا پا کر خوشی سے دوڑتا ہوا اپنے ہمجولیوں کو دکھانے جائے۔ پران ناتھ اپنے آقائے نامدار کو عرضی لکھ رہے تھے کہ میری والدہ سخت بیمار ہو گئیں اس وجہ سے حاضر خدمت ہونے میں دیر ہوئی۔ امید وار ہوں کہ ایک ہفتہ کی اتفاقیہ رخصت عطا فرمائی جائے۔ سیوتی کو دیکھ کر جھٹ اپنی درخواست چھپا دی اور مسکرائے۔ انسان کیسا مکار ہے۔ اپنے آپ کو بھی دھوکا دینے سے نہیں چوکتا۔

سیوتی۔ ذرا اندر چلو۔ تمہیں برجن کی کبتا سنواؤں۔ پھڑک اٹھو گے۔

پران۔ اچھا اب انہیں کبتا کا شوق ہوا ہے۔ انکی بھاوج بھی تو گایا کرتی تھیں "تم تو شیام بڑے بے کھبر ہو۔"

سیوتی ۔ ذرا چلکر سنو تو نہ پیچھے ہنسنا ۔ مجھے تو اسکی شاعری پر اچنبھا ہو رہا ہے۔
پران ۔ چلو ایک خط لکھکر آتا ہوں ابھی
سیوتی ۔ آپ ابھی مجھے اچھا نہیں لگتا ۔ میں آکے کاغذ نوچ ڈالونگی ۔

سیوتی پران ناتھ کو کشاں کشاں لے آئی ۔ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہے تھے کہ برجن نے کوئی معمولی بھجن بنایا ہوگا ۔ اُسی کو سُنانے کے لئے بیقرار ہو رہی ہوگی مگر جب اندر آکر بیٹھے اور برجن نے شرماتے ہوئے اپنی ہندی نظم "پریم کی متوالی" پڑھنی شروع کی تو حضرت کی آنکھیں کھل گئیں ۔ نظم کیا تھی درد دل کا ایک دریا اور راز اُلفت کا ایک دفتر تھی ۔ للو سُنتے تھے اور وجد میں آ آکر جھومتے تھے ۔ الفاظ کی ایک ایک نشست پر خیال کی ایک ایک پرواز پر بے اختیار دل سے داد نکلتی تھی ۔ انہوں نے بہت سے شاعروں کے کلام دیکھے تھے ۔ مگر یہ بلند پروازی ۔ یہ تازگی یہ جذبہ کہیں نظر نہ آیا تھا ۔ اس وقت کا سا سماں بندھا ہوا تھا جب طلوع آفتاب کے قبل بادِ نسیم لہراتی ہوئی چلتی ہے ۔ کلیاں کھلتی ہیں ۔ پھول مہکتے ہیں اور آسمان پر ہلکی سُرخی چھا جاتی ہے ۔ ایک ایک شعر میں گلہائے تازہ کی شوخی اور شبنم کی تازگی موجود تھی ۔ اُس پر برجن کا سُریلا پن اور آواز کی گرمی نشہ پر بادِ صبا کا کام کر رہی تھی ۔ آہ! یہ وہ اشعار تھے جن پر برجن نے دل کو شمع کی طرح جلایا تھا ۔ للو تمسخر کی نیت سے آئے تھے مگر جب وہ اُٹھے ہیں تو واقعی ایسا محسوس ہوتا تھا گویا پہلو سے دل نکل گیا ۔ ایک روز انہوں نے برجن سے کہا "تمہارا کلام چھپے تو خوب مقبول ہو" برجن نے سر جھکا کر کہا مجھے یقین نہیں کہ کوئی اسکی قدر کرے گا ۔

پران ناتھ ۔ ایسا ممکن ہی نہیں ۔ اگر دلوں میں کچھ بھی احساس باقی ہے تو تمہارے کلام کی ضرور قدر ہوگی ۔ اگر ایسے لوگ موجود ہیں جو پھولوں کی مہک سے سرشار ہو

جاتے ہیں جو چڑیوں کی چہک اور چاندنی رات کے سہانے پن کا لطف اٹھا سکتے ہیں
تو وہ تمہاری کبتا کو ضرور دل میں جگہ دینگے۔

برجن کے دل میں وہ گدگدی پیدا ہوئی جو ہر ایک مصنف کو اپنے فکر سخن کی داد ملنے اور اپنے کلام کے مقبول و مطبوع ہونے کے خیال سے ہوتی ہے۔ تاہم وہ نہیں نہیں کرتی رہی مگر وہ نہیں ہاں کے برابر تھی۔ الہ آباد سے اُن دنوں "کملا" نام کا اچھا رسالہ نکلتا تھا۔ پران ناتھ نے "پریم کی متوالی" کو وہاں بھیجدیا۔ ایڈیٹر صاحب ایک نکتہ سنج بزرگ تھے۔ دل کھولکر کلام کی داد دی۔ اور جب یہ متوالی نازنین کملا کے وشنوں میں رنگین لباس پہنکر نکلی تو لوگوں نے اُسے دلوں میں بٹھایا اور آنکھوں میں جگہ دی۔ شاید ہی کسی شاعر کی فکر اولین کو ایسی قبولیت عام نصیب ہوئی ہو۔ لوگ پڑھتے تھے اور حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکتے۔ سخن فہم حلقوں میں ہفتوں تک متوالی نازنین کے چرچے رہے۔ کسی کو یقین ہی نہ آتا۔ کہ یہ ایک گمنام شاعرہ کا کلام ہے۔ فیصلہ یہی تھا کہ اس شاعر کو الہام ہو گیا ہے۔

اب ہر ماہ کملا کے صفحے برجن کے کلام سے مزین ہونے لگے اور "بھارت مہلا" کو پسند عام نے شاعری کے مسند اعزاز پر جا بٹھایا۔ "بھارت مہلا" کا نام بچہ بچہ کی زبان پر چڑھ گیا۔ کوئی اخبار یا رسالہ ایسا نہ تھا جو "بھارت مہلا" کے کلام سے اپنے تئیں نہ سنوارتا ہو۔ اخبار کھولتے ہی ناظرین کی آنکھیں "بھارت مہلا" کو ڈھونڈھنے لگتیں۔ ہاں اُسکی آتش بیانیاں اب کسی کو حیرت میں نہ ڈالتیں۔ اُس نے خود شاعری کا معیار اونچا کر دیا تھا۔ قلم سخن کی روانی کے لئے کمال شاعری خواہ وہ کتنا ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو ایک لازمی امر تھا نہ کہ قابل حیرت۔

تین سال تک کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ کہ "بھارت مہلا" کون ہے۔ آخر پران ناتھ سے نہ رہا گیا۔ برجن سے اُنہیں سخن فہمانہ عقیدت ہوگئی تھی اور دو مہینوں سے اُس کے حالاتِ زندگی لکھنے کی فکر میں پریشان تھے۔ سیوتی کے ذریعہ سے رفتہ رفتہ اُسکے سوانح زندگی سب دریافت کر لئے اور "بھارت مہلا" کے عنوان سے ایک پُر زور مضمون لکھا۔ پران ناتھ نے پہلے کبھی کوئی مضمون نہ لکھا تھا مگر فرطِ عقیدت نے ان کے قلم کو تیز اور فصیح بنا دیا تھا۔ عبارت اول سے آخیر تک چُست اور خیالات پاکیزہ تھے۔

اس مضمون کا شائع ہونا تھا کہ برجن کو ہر چہار طرف سے قدردانی کے نذرانے ملنے لگے۔ رادھا چرن مُراد آباد سے اُسکی ملاقات کو آئے۔ کملا۔ اما دیئی۔ سیتا۔ چندرا کنور اور کتنی ہی پُرانی سکھیاں جنہوں نے یاد بھلا دی تھی۔ ہر روز برجن کے درشنوں کو آنے لگیں۔ بڑے بڑے صاحبِ نظر روسا جو خودداری کے شان میں حکام کے روبرو بھی سر نہ جھکاتے تھے۔ برجن کے دیوانہ کی زیارت کو آتے تھے۔ چندرا خود تو نہ آ سکی مگر خط میں لکھا جی چاہتا ہے۔ کہ تمہارے پیروں پر سر رکھ کر گھنٹوں روؤں۔ برجن کے دیوانہ پر ہر دم ایک میلہ سا لگا رہتا تھا۔

امتحان

منشی سیوک لال اور پرتاپ چند جوں ہی سوامی برہمانند جی کے روبرو پہنچے کہ انہوں نے چونک کر دیکھا۔ اُن کی بڑی بڑی آنکھیں نورِ حقیقت سے ایسی لبریز تھیں جیسے گیان سروور آب [illegible] سے۔ دونوں نو واردوں نے اُن کے قدم آنکھوں سے لگائے۔ سوامی جی نے انہیں اُٹھا کر چھاتی سے لگا لیا۔ اور منشی جی سے یاترا سفر کی کیفیت پوچھتے رہے۔ بعد ازاں مسکرا کر پرتاپ کی طرف دیکھا اور نہایت شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے "عقدہ تو نہیں گئے"

پرتاپ چند کچھ جواب نہ دے سکا۔ اُسے اس وقت ایک سرورِ قلب حاصل تھا جس کا مزہ دل ہی جانتا ہے [illegible] سوامی جی کے [illegible] معلوم ہوتا تھا گویا وہ [illegible] بے پایاں میں غوطہ لگا رہا ہے۔ اس کا دل [illegible] کسی پُرزور کشش سے کھنچا ہوا چلا جاتا تھا۔ جیسے کوئی کشتی [illegible] لنگر ٹوٹ کر بہہ جاتی ہے۔ یہی کیفیت اُس کی ہو رہی تھی [illegible]۔ اُسے حیرت ہوتی تھی کہ میری یہ حالت کیوں ہوتی جاتی ہے۔ حسن و عشق کی کشش کا اُسے کچھ تجربہ ہو چکا تھا مگر اس وقت محبت کا جو پُرسرور غلبہ اُس کی روح پر ہو رہا تھا۔ وہ خیال اور فکر و تمیز کے اندازے سے باہر تھا۔

مگر یہ کیفیت صرف پرتاپ ہی کی نہ تھی۔ منشی جی حیرت سے دیکھ رہے تھے کہ سوامی برہمانند جی کی پُرنور آنکھیں بھی آب گوں ہو گئی ہیں اور اُن کے روشن چہرہ پر جو سُرور اور

میں آئیں جو الہ آباد کے کتب خانوں میں بھی نظر نہ آتی تھیں۔ یہ اُن زائرین کی یادگار تھیں
جو وقتاً فوقتاً یہاں آئے تھے اور جب کبھی دُنیا کے کسی حصہ میں کسی صیغۂ علم پر کوئی
معرکے کی کتاب لکھی جاتی تو خود مصنف یا سوامی جی کا کوئی معتقد اسے ضرور یہاں
بھیج دیا کرتا۔ ایک بادشاہ تھا کہ اپنے تخت پر بیٹھا ہوا دور دراز کے ممالک سے علم و تحقیق
کے خراج لیا کرتا تھا۔ مادی سلطنت ایک محدود شے ہے مگر روحانی سلطنت دُنیا سے بھی
زیادہ وسیع اور وسعت سے بھی زیادہ فراخ ہے۔ تخت نشین کی فقیری بوریئے کے سامنے کوئی
ہستی نہیں۔ پرتاپ چند نے اپنی عقل و ذہن کا دامن اس علم و ہنر کے کان سے خوب
آزادی کے ساتھ بھرا اور یورپ کی کئی زبانوں کا بھی ماہر ہو گیا۔

پانچ سال گزر گئے۔ گرمی کے دن تھے۔ گنگا اور دریا نے گرمی سے تنگ آ کر اپنے
سینہ کا دامن [illegible] شروع کئے تھے۔ آسمان کا [illegible] آنکھوں میں کھٹکتا [illegible]
طرف [illegible] بالی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک روز پرتاپ چند [illegible]
[illegible] سوامی جی نے منشی سجیون لال سے کہا۔

"[illegible] بالا جی کو اب یہاں زیادہ [illegible] رہنے کی [illegible] ضرورت نہیں
کئی دن سے سوچ رہا ہوں کہ انہیں رخصت کر دوں [illegible] ایسی محبت ہو گئی ہے [illegible]
کا خیال [illegible] آپ کو میری اس کمزوری پر تعجب ہوتا ہو گا۔ مگر میں آج آپ
سے کہتا ہوں کہ پرتاپ چند میرا بیٹا ہے"

سجیون لال۔ (حیرت سے) ایں۔

سوامی جی۔ اسی خیال سے آپ میری کمزوری کو معافی کے قابل سمجھیں۔ پہلے ہی جب میری
نگاہ اس کے چہرہ پر پڑی تو پرانی محبت تازہ ہو گئی۔ اور میں ضبط و استقلال سے کام

لیتا تو یقین تھا کہ آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے اور راز افشا ہو جاتا۔ آج پچیس
سال گزر گئے جب میں نے دنیا سے منہ موڑا۔ اس وقت کی تصویر آج بھی میری نگاہوں
کھینچی ہوئی ہے۔ جب میں شام کے وقت سُبا ماں سے رخصت ہوا تھا، پرتاپ چھ
سال کا بھی نہ ہوا تھا۔ وہ بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ میں نے اسکی طرف آنسو بھری
آنکھوں سے دیکھا اور ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ مگر پرماتما کے سوا اور کون جان سکتا ہے
اسے اپنے خیال سے دور رکھنے کے لئے میں نے کتنے ضبط اور جبر سے کام لیا۔ برسوں تک
تم اسکی موہنی صورت آنکھوں کے سامنے پھرتی رہتی تھی۔ بارے ایشور کی دیا سے میں
نفس پر غالب ہوا اور اٹھارہ برسوں تک پرتاپ ایک لمحہ کے لئے بھی میرے
دھیان میں نہیں آیا۔ مگر جوں ہی آپ کے ساتھ اسے دیکھا پرانی یاد تازہ ہو گئی۔ مجھے
بیراگ پر گھمنڈ تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب دنیا کا میرے دل میں گزر نہیں ہو سکتا
مگر لالہ جی نے میرا یہ غرور چکنا چور کر ڈالا۔ میں اتنے دنوں سے لوگ ... بھی
ایک ... ہوں۔ یہ تعلق محض جسمانی نہیں بلکہ روحانی ہوتا ہے اور لوگ
... بیراگ کوئی بھی اس تعلق کو نہیں توڑ سکتا۔
منشی سنجیون لال۔ مہاراج! آپ نے جو کچھ کر دکھایا وہ تپسیا سے کم نہیں۔ سُبا ما
جیسی بیوی، پرتاپ جیسا بیٹا ہر شخص نہیں پا سکتا۔
لالہ جی۔ مگر یہ سب ایشور کی رچنا تھی۔ مجھے شروع ہی سے اپنے بھائیوں کی بھلائی
کا خیال پیدا ہو گیا تھا اور جو کچھ میرے لئے ہو سکتا تھا اس سے انکی خدمت کرتا
رہتا تھا۔ مگر یہ دلی آرزو تھی کہ ایشور میرے گھر میں کوئی قوم کا فدائی پیدا کرتا۔ ایشور
سے ہمیشہ یہی پرارتھنا کیا کرتا۔ آخر لکشمی جی نے سُبا ما کو درشن دیا اور سُبا ما نے

مہاودانی سے مُنہ مانگا بردان پایا۔ اسی رات کو مجھے بھی ویراگ کا سندیسہ ملا۔

سجیون لال۔ ایشور کی لیلا اپار ہے۔ اگر مہاراج ویراگ نہ پلٹتے تو بالاجی آج کسم کی سرن لیتے۔

سوامی جی۔ بالاجی ابھی تہ پر نہیں پہنچے ہیں اور نہ میں انہیں جتانا مناسب سمجھتا ہوں ورنہ وہ یہاں سے جانا ہرگز منظور نہ کریں گے۔ دیکھئے۔ ان تھوڑی سی مدت میں انہوں نے کیسا حیرت انگیز کام کیا ہے۔ اس سن میں ایسا ضبط والا لوگ میں نے نہیں دیکھا۔ مجھے فخر ہے کہ میں ایسے بیٹے کا باپ ہوں۔

سجیون لال۔ پچھلے دنوں کونٹ پنڈت لنشام سے انہوں نے راج نیت پر جو مباحثہ کیا اُسے سُنکر میں حیرت میں آگیا۔

سوامی جی۔ یہ کونٹ علماء میں سرآمد روزگار سمجھے جاتے ہیں۔

سجیون لال۔ مجھے لنکا میں ایک بار ان سے ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔

سوامی جی۔ جوہر عالم تو ایک ایسی چیز ہے جو شوق و شغف سے روز بروز ترقی پا سکتی ہے۔ اسوقت بالاجی کو ہمیشہ کے لئے رخصت کرنے سے پہلے میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ انکے دل میں کمزوری تو نہیں باقی ہے۔ مجھے تجربہ ہے کہ بعض آدمی مدت تک ویراگ میں رہنے کے بعد یکایک تارک الدنیا کی کمزوریاں کر بیٹھتے ہیں۔ خصوصاً اُنکے لیے جو دُنیا میں رہ کر اُس سے الگ رہنے کا حوصلہ رکھتا ہو انتہا درجہ کے مضبوط دل کی ضرورت ہے۔ ہم اور آپ اس کنج خلوت میں بیٹھے ہوئے دُنیا کی گمراہیوں اور لغزشوں سے بچے رہ سکتے ہیں مگر پانی پر کنول بن جانا اس سے بدرجہا مشکل ہا سکیں۔

سجیون لال۔ مجھے یقین کامل ہے کہ کوئی دُنیاوی طاقت بالاجی کو فرض بعد حق کے

راستہ نہیں پھیر سکتی۔

سوامی جی۔ خیال تو میرا بھی ایسا ہی ہے مگر یقین جب ہی ہو سکتا ہے جب ایک بار انہیں آزمائشوں میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ان کا یہ ضبط اور ترک ارادی ہمیشہ طبیعت ثانی قوم کی خدمت پہلے تو ایک تپسیا معلوم ہوتی ہے مگر دنوں کے ساتھ ساتھ نافہمائے قوم کا ظاہری اعزاز و اقتدار بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ اُسکے روبرو بادشاہوں کی گردنیں بھی جھکنے لگتی ہیں اور کبھی کبھی ایسا ہوا ہے کہ جو آنکھیں شمشیر برہنہ کے سامنے کبھی نہیں جھپکیں وہ مئے گلفام کے ایک پیالہ سے سرشار ہو گئی ہیں اور جو دل سختیوں اور آفتوں کے طوفان سے بھی نہیں ڈرے وہ مدارات و عنایات کی خوشگوار [illegible] نہ سنبھل سکے

چیمون لال۔ اس کا امتحان کیونکر ہوگا؟

سوامی جی۔ ہم اور آپ ملکر بالاجی کے نفس پر زور ڈالیں گے۔ آپکو اس لئے شریک کرنا چاہتا ہوں کہ میں تنہا شاید [illegible] کی آتما پر کچھ اثر نہ پہنچا سکونگا۔ اُنکی یوگ شکتی ان دنوں بہت بڑھی ہوئی ہے۔

پرتاپ چند گیان سرود کے کنارے اپنے خیال میں مگن بیٹھا ہوا تھا کہ اُسے کچھ غنودگی سی معلوم ہوئی اور جمائیاں آنے لگیں۔ مگر اس نے چونک کر آنکھیں ملیں اور اپنے خیالات میں محو ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس پر پھر غنودگی کا غلبہ ہوا اور آنکھیں جھپکنے لگیں جیسے کوئی رات بھر کا جاگا ہوا آدمی صبح کے وقت نیند سے متوالا ہو جائے پرتاپ کو تعجب ہوا کہ آج مجھے اتنی نیند کیوں آرہی ہے۔ اُس نے پانی کے چھینٹے منہ پر دئے اور دل میں مضبوط ارادہ کر لیا کہ اب نیند کو ہرگز نہ آنے دونگا۔ لیکن آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا

تھا کہ پھر وہی کیفیت ہوئی۔ آنکھیں خواب گراں سے مخمور ہو کر مُندنے لگیں اور انگڑائیوں کے مارے اعضا ٹوٹنے لگے۔ پرتاپ کی سمجھ میں نہ آیا کہ میری یہ حالت کیوں ہو رہی ہے۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور کچھ دیر تک تیزی سے ٹہلتا رہا۔ بعد ازاں اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔

اس طرح نیند نے اُس پر پے در پے ناکام حملے کئے۔ ایک سے ایک پُر زور، مگر ساتواں حملہ پرتاپ سے برداشت نہ ہو سکا۔ آنکھیں بند ہو گئیں اور گردن جھک گئی۔ اُس کی آتما ایک بار مغلوب ہو گئی۔

مدہوشی کا غلبہ ہوتے ہی پرتاپ چند کو ایسا معلوم ہوا کہ میں کسی پُر فضا باغ میں آ گیا ہوں۔ عنبر بیز ہوائیں چل رہی ہیں اور ہر ایک درخت پر خوش رنگ اور شیریں نوا چڑیاں بیٹھی چہک رہی ہیں۔ ہوا میں کچھ ایسی فرحت ہے، چڑیوں کی شیریں نوائیوں میں وہ مستانہ پن اور پھولوں کی مہک میں وہ نشہ کہ دل و دماغ متوالے ہوئے جاتے ہیں۔ بہار اپنی دلفریبیوں کے پورے سامان لیکر آ پہنچی ہے۔ پرتاپ نے متحیر ہو کر کہا میں اس جنت کدہ میں کیونکر آ پہنچا ہوں۔ ابھی تو میں گیان سروور کے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ یہ سوچ کر اُس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا اور اپنا یقین کر لیا کہ یہ خواب نہیں ہے۔ سر دست میں بھٹک کر کسی کے باغیچے میں چلا آیا۔

وہ اِدھر اُدھر روشوں میں ٹہلنے لگا کہ دفعتہً ایک نازنین سایہ دار درختوں کی آڑ سے خراماں خراماں آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس پر حسن کا روپ تھا اور شباب الف کا سنگار۔ وہ روشنی کی ایک تصویر معلوم ہوتی تھی۔ پرتاپ چند کو دیکھتے ہی وہ ٹھٹکی اور چشم پُر نم سے دیکھ کر بولی۔ "پرتاپ"

پرتاپ چند نے اسے پہچان لیا۔ وہ برج رانی تھی مگر اس آب و گل کی برجن سے بدرجہا حسین۔ متحیر ہو کر بولا۔ "برجن! تم یہاں کہاں!"

برج رانی ۔ جہاں تم ہو وہاں میں بھی ہوں ۔ محبت نے تمہارا پتہ دیا ۔ اگر تم مہک بنکر بھی پھولوں میں سما جاتے تو میں تمہیں ڈھونڈھ نکالتی ۔ تمہیں شاید معلوم نہیں میں نے دوسرا جنم لیا ہے ۔

پرتاپ ۔ (حیرت سے) دوسرا جنم ۔

برج رانی ۔ ہاں ایک میرا جنم دیو لوک میں ہوا ہے مگر یہاں بھی جب سے ہوش سنبھالا ہے تمہارے بیوگ میں گھل رہی ہوں ۔ یہ میرے باپ کا باغ ہے تمہارا استھان یہاں سے بہت قریب ہے تمہیں معلوم نہیں مگر میں دن میں کئی بار تمہارے درشن کرتی رہی ہوں ۔ میرے بھاگ اچھے تھے کہ اس لوک میں جنم ہوا ۔ ایشور نے شاید میری آرزوئیں پوری کرنے کے لئے مجھے تمہارے پہلو میں بھیجا ہے ۔

پرتاپ چند ۔ برجن ! ایسی باتیں زبان سے نہ نکالو ۔ کیا تم کو نہیں معلوم میرا تم سے ہمیشہ پاک تعلق رہا ہے ۔

برج رانی ۔ پیارے ۔ ان خیالوں سے میرے ابھاگے دل کو تسکین نہیں ہوتی ۔ پریم کی آگ نے ان سب خیالات کو جلا کر خاک کر دیا ہے میں نے خیال کیا تھا کہ تم نظروں سے دور ہو جاؤ گے تو دل تمہیں بھلا دیگا ۔ میں نے دل کو بہت سمجھایا ۔ مدتوں شعر و سخن سے جی بہلاتی رہی ۔ تم آج بھی لوگوں کو میرے کلام کا مداح پاؤ گے میں نے شہرت اور عزت اور دولت سب پائی اور سب سے جی سیر ہو گیا مگر تمہاری محبت کا نقش دل سے نہ مٹا ۔ دوسرا جنم لیکر بھی اسی آرزو میں گھلتی رہی ہوں برسوں سے یہی سوچ رہی ہوں کہ تمہیں اپنی داستان غم سناؤں یا نہ سناؤں ۔ کبھی یہ خیال ہوتا تھا کہ اگر محبت میں روحانی طاقت ہے تو ہم اور تم ضرور ملینگے

— کبھی سوچتی کہ تم مجھے بھول گئے ہو گے مگر دل کو کسی طرح نہ سمجھا سکی۔ آج مجبور ہو کر
میں نے شرم و حیا کو طاق پر رکھا اور تمہارے سامنے کھڑی ہوں۔ تم میرے لئے جو فیصلہ مناسب
سمجھو وہ کرو۔ میں تمہاری ہوں۔ خواہ مجھے اپنے پہلو میں جگہ دو خواہ خیال میں بھی نہ لاؤ۔ میں تمہاری
سیوا میں رہ کر تمہارے ساتھ سب کچھ سہنے کے لئے تیار ہوں۔ میرے پتا اس لوک کے
راجہ ہیں۔ میرے سوا ان کے کوئی اولاد نہیں مگر میں سب تیاگ دونگی۔ میں تمہارے ساتھ
فاقے کرونگی۔ کنوئیں سے پانی کھینچونگی ......"

یہ کہتے کہتے برجن کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور گلا رندھ گیا

پرتاپ چند عجیب مخمصے میں مبتلا تھا۔ برجن نے اُسکی محبت کا راگ گایا تھا اور
یہ راگ سُنکر ایسا کون مرد ہے جو مدہوش نہ ہو جائے۔ وہ ذرا دیر کے لئے بالکل بے کیف ہو گیا۔
سوچنے لگا آہ کیسی سچی محبت ہے کیسی عجیب قربانی۔ کیسی پاکیزہ کیسی بے غرض! یہ برجن تو سچ مچ
دیوی ہے۔ تب انسانوں کی دیوی تھی اب دیوتاؤں کی دیوی ہے تو میرے لئے یہ بہشت اور
یہ دولت اور یہ سکھ تیاگ دیگی! میں کیسے تیری اس محبت کی داد دوں۔ میں تجھے کیسے بتلا
دوں کہ میں ان قربانیوں کے لائق نہیں ہوں۔

پرتاپ چند انہیں خیالات میں ڈوبا ہوا تھا اتنے میں برجن نے نزاکت سے اُسکا
ہاتھ پکڑ لیا اور بولی: "پیارے میں نے تم پر فیصلہ چھوڑ دیا مگر دل کانپ رہا ہے کہ کہیں
بے انصافی نہ کر بیٹھو (ہاتھ جوڑ کر) ایسا نہ کرنا! نہیں تو تمہاری برجن مر جائیگی۔ میں تم
سے کچھ نہیں مانگتی۔ میں تم سے محبت نہیں مانگتی۔ میں تمہارا دل نہیں مانگتی۔ میں تم
سے عمر بھر تمہارے ساتھ رہنے کی۔ تمہاری خدمت کرنے کی اجازت چاہتی ہوں۔ اس سے زیادہ
میں اور کچھ نہیں مانگتی۔ تمہارا دل میرے مان کا نہیں۔ اُسے لینے کے لئے میرے پاس کچھ

نہیں ہے۔ میری محبت پُرغرض ہے جسن و شباب چند روزہ۔ دولت فانی۔ تمہاری محبت غیر محدود ہے......"

پرتاپ چند کے جی میں آیا کہ اس دیوی کے قدموں پر سر رکھ دوں۔ وہ کچھ جواب نہ دے سکا۔ برجن کی روحانی عظمت نے اسے بالکل پست کر دیا۔ قریب تھا کہ وہ اس خود فراموشی کے عالم میں اپنا برت بھول جائے کہ یکایک سوامی برہمانندجی کا یہ قول اُسے یاد آگیا:۔ "ہر نیک اور اعلیٰ کام کے راستے میں بڑے بڑے سخت امتحانات کا سامنا ہوتا ہے۔ پورا مرد ہے جو ان امتحانات سے بے داغ نکل جائے۔ بسا اوقات یہ امتحانات تنگدستی کی صورت بدل کر آتے ہیں اس وقت ان سے مقابلہ کرنا اور بھی دشوار ہو جاتا ہے"۔ اس قول کے یاد آتے ہی پرتاپ کا خیال کہیں سے کہیں جا پہنچا۔ ضرور میں اس وقت امتحان میں پڑا ہوا ہوں۔ وہی طاقت جو مجھے...سا پرکھ رہی ہے برجن کی زبان و دل پر بھی اپنا جادو چلا رہی ہے یہ خیال کرتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ "برجن۔ مجھ میں یہ بیان کرنے کی طاقت نہیں کہ اس وقت تم سے مل کر طبیعت کیسی خوش ہوئی۔ مجھے فخر ہے کہ تم جیسی پاکیزہ اور صاف دیوی مجھ سے محبت رکھتی ہے۔ اس محبت کے مقابلہ میں میری ہستی کی کچھ وقعت نہیں۔ کاش میں اس قابل ہوتا کہ اس اعلیٰ پریم کی کچھ قدر کر سکتا۔ مجھ جیسا مٹی کا انسان تمہارے لائق نہیں۔ میں تمہاری پرستش کر سکتا ہوں مگر محبت نہیں۔ میں تمہارے قدموں کی خاک پیشانی پر مل سکتا ہوں مگر تمہاری پاکیزہ محبت کو اپنی بشریت سے آلودہ نہیں کر سکتا"۔

برج رانی کی آنکھوں سے آنسو کا دریا بہہ نکلا۔ ذرا دیر کے بعد بولی:۔ "تمہارا فیصلہ مجھے بسر و چشم منظور ہے۔ ایشور تمہیں سرسبز کرے۔ یہی میری دعا ہے۔ میرے لئے یہی خوشی کافی ہے کہ میری عزت اور محبت تمہارے دل میں موجود ہے۔ پرتاپ یقین مانو۔ میں صدق دل

سے اپنی خود غرضی پر نادم ہوں۔ محبت انسان کو خود غرض بنا دیتی ہے۔ یہ اس کا تقاضا ہے۔ حالانکہ میں تمہاری محبت کی طالب نہ تھی۔ میری یہ خواہش نہ تھی کہ تمہاری محبت سے پھلونگی پھولونگی۔ خیر نوشتۂ تقدیر سے کیا چارہ! میری آخری التجا یہ ہے کہ اب میری یاد اپنے دل سے نکال ڈالنا۔ ایسا نہ ہو کہ کسی وقت میری یاد تمہیں ستائے اور رلائے۔ ہائے! تم رو رہے ہو۔ پیارے رو مت۔ ایشور کے لئے اپنے اوپر ایسا ظلم نہ کرو ورنہ پرتاپ پچھتاؤ گے۔ تمہیں تجربہ ہو جائیگا کہ قوم کی خدمت اور قوم کی محبت دل کے لئے کافی غذا نہیں ہے۔ تمہیں سب کچھ ملیگا مگر برجن نہ ملیگی۔ مجھے پرماتما نے تمہارے لئے پیدا کیا ہے اسے کیا جواب دوگے؟"

پرتاپ نے روتے ہوئے جواب دیا "برجن میری پرتگیہ مت توڑو۔ تمہارے روبرو میں کھڑا ہوکر میں اپنے برت پر قائم نہیں رہ سکتا۔ مجھے اب رخصت کرو۔ میں جبتک زندہ رہونگا تمہاری پرستش کرتا رہونگا۔ تمہاری یاد میرے دل سے نہیں نکل سکتی۔"

یہ کہتے کہتے دفعتاً اسکی زبان بند ہوگئی۔ جب کبھی خوب کھل جاتا ہے تو اسکا بولنا بند ہو جاتا ہے۔ برجن نے سر جھکا کر اسے پرنام کیا اور نظروں سے غائب ہوگئی۔

شام کا وقت تھا۔ ہماچل سر پر سنہرا تاج رکھے کھڑا تھا۔ چڑیاں بسیرا لے رہی تھیں آسمان پر سے دو ایک شفق رخ نظر تارے گھورنے لگے تھے۔ پرتاپ نے دیکھا کہ برجن گیان سروور کے نیلگوں پانی میں کھڑی ہے گویا جل دیوی اپنے سنگھاسن پر رونق افروز ہے اور ایسی آواز سے جس میں کوئل کی کوک، پپیہے کی ہوک اور شیاما کی چہک ملی ہوئی ہے یہ دلسوز نغمہ الاپ رہی ہے۔

بن ھری کیوں راکھیں من دھیر

گمر آگن نہ سُہات رین بِن ۔ بسرے بھوجن نیر
برن ہری کیوں راکھیں من دھیر

مچھلیاں روتی تھیں اور پیڑ پتے سر دُھنتے تھے۔ برجن کمر تک پانی میں چلی گئی اور پھر یہ آواز آئی :-

پن پن وہی سُرت آوت ۔ چت چوت جما تیر
برن ہری کیوں راکھیں من دھیر

برجن نے پرتاپ چند کی طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑے پھر گلے تک پانی میں چلی گئی ۔ ایک کمل کھل گیا۔ یہ آواز آئی :-

مت اُبجس آہو ہیرا پنے ۔ کٹھن ملن کی پیر
برن ہری کیوں راکھیں من دھیر

چندرما سے کان لگائے سُن رہے تھے۔ آسمان کی سُرخی مٹ چلی تھی برجن نے پرتاپ چند کو پرنام کیا اور پانی میں غوطہ لگایا۔ پورنماشی کا چاند دیکھتے دیکھتے ڈوب گیا۔ پرتاپ ڈنڈا پیر لڑکھڑا لئے اور بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا ۔

—— ✻ ——

گنگا جمنا کا ملاپ

ہمارے ناظرین مادھوی کے نام سے غیر مانوس نہ ہونگے جس طرح ایک نگرینہ کسی پُرفن کاریگر کے ہاتھوں میں موتیوں کے تول بکنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح برج رانی نے مادھوی کو سکھا پڑھا کر اپنے ہی سا بنا لیا تھا۔ اُسکی خلقی نیک مزاجی اور شرافت کی دو ایک مثالیں برجن کے اُن خطوط میں ملتی ہیں جو اُس نے مجگاؤں سے کملا چرن مرحوم کے نام لکھے تھے۔ کبھی کبھی جنگلی پھولوں میں وہ بو باس اور رنگ روپ مل جاتا ہے جو سجی ہوئی روشوں اور مرصع کیاریوں کو کبھی میسر نہیں ہو سکتا۔ مادھوی بھی تو ایک غریب جاہل برہمن کی لڑکی مگر قدرت نے اُسے جس نعمت کے دل پاکیزہ اوصاف عطا کئے تھے اور اُس میں تعلیم و تربیت قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی تھی۔ مادھوی اور برجن کا ملاپ اُس وقت ہوا جب برجن سسرال آئی تھی۔ اس بھولی بھالی لڑکی نے اسی وقت سے برجن کے ساتھ غیر معمولی محبت ظاہر کرنا شروع کی۔ معلوم نہیں وہ اُسے دیوی سمجھتی تھی یا کیا۔ مگر کبھی اس نے برجن کی مرضی کے خلاف ایک لفظ بھی مُنہ سے نہیں نکالا۔ برجن بھی اُسے اپنے ساتھ سلاتی۔ کھلاتی اور اچھے اچھے ریشمی کپڑے پہناتی۔ اس سے زیادہ محبت وہ اپنی چھوٹی بہن کی بھی نہیں کر سکتی تھی۔

دل کو دل سے لگاؤ ہوتا ہے۔ برجن کو سسرال میں آنے کے بہت پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ میں ہی پرتاپ چند کے خوابوں کی پری ہوں۔ اُسکی ایک ایک نظر

میں ایک ایک بات میں وہ اپنی محبت کی جھلک دیکھتی اور افسوس کرتی۔ ایک روز جبکہ
وہ کملا چرن کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی اُسے یہ خیال کر کے رونا آیا تھا کہ میری تو یوں
لطف سے گزرتی ہے اور بیچارے پرتاپ کے دل میں نہ جانے کیا بیت رہی ہوگی۔ مادھوی
اسوقت گیارھویں سال میں تھی اور اُس کے رنگ روپ کا نکھار، سلیقہ، گفتگو اور گن دیکھ
دیکھ کر سب کو حیرت ہوتی تھی۔ برجن کو معاً خیال آیا کیا میری مادھوی اس قابل نہیں
کہ پرتاپ اسے اپنے گلے کا ہار بنائیں۔ اُس دن سے وہ مادھوی کی تربیت اور
خاطرداری میں اور بھی زیادہ منہمک ہوگئی۔ وہ سوچ سوچ کر دل میں پھولی نہ سماتی کہ
جب مینا سولہ سترہ سال کی ہوجائیگی اُسوقت میں پرتاپ کے پاس جاؤنگی اور اُس سے
ہاتھ جوڑ کر کہونگی کہ مادھوی میری بہن ہے اُسے آج سے تم اپنی چیری سمجھو۔ کیا پرتاپ
میری بات ٹال دیں گے؟ نہیں ایسا وہ نہیں کر سکتے مزہ تو جبھی کہ خود مادھوی کو
اپنی بنا لینے کی مجھ سے استدعا کریں۔ اسی خیال سے برجن نے پرتاپ کے چیدہ اوصاف حمیدہ
کا نقش مادھوی کے دل میں بٹھانا شروع کر دیا تھا کہ اس کا رواں رواں پرتاپ کی
محبت میں سرشار ہو جاوے۔ وہ جب پرتاپ چند کا بکھان کرنے لگتی تو خود بخود
اُسکے الفاظ غیر معمولی طور پر شیریں اور فصیح ہو جاتے۔ رفتہ رفتہ مادھوی کا بچہ دل پرائی
اُلفت کے مزے لینے لگا۔ آئینہ میں بال پڑ گیا۔

بھولی مادھوی سوچنے لگی میں کیسی خوش قسمت ہوں۔ مجھے ایسا سوامی ملیگا
جس کے پیر دھونے کے لائق بھی میں نہیں ہوں۔ مگر کیا وہ مجھے اپنی چیری بنائیں گے۔ کچھ
ہو میں ہندوستان کی رانی ہونگی۔ اگر پریم میں کچھ کچاؤ ہے تو میں انہیں ضرور اپنا لونگی۔ مگر
اس غریب کو کیا معلوم تھا کہ یہ امید حسرت بنکر آنکھوں کے راستہ بہہ جائیگی

اُس کا پندرھواں سال پورا بھی نہ ہوا تھا کہ برجن پر خانہ تباہی کے صدمے آپڑے
اس طوفان کے جھونکے نے مادھوی کی اس خیالی پھلواڑی کا ستیاناس کر دیا۔ اسی
اثنا میں پرتاپ چند کے لاپتہ ہونے کی خبر ملی۔ طوفان نے جو کسر رکھ چھوڑی تھی وہ
اس آگ نے جلا کر راکھ کر دی۔

مگر خیال کوئی چیز ہے تو مادھوی پرتاپ چند کی بیوی بن چکی۔ اس نے اپنا تن
اور من انہیں سونپ دیا۔ پرتاپ کو خبر نہیں مگر آج حالت ایسی ہے کہ بہا چیز ملی ہے جسکے
مقابلہ میں دنیا کی کوئی چیز نہیں ٹھہر سکتی۔ مادھوی نے صرف ایک بار پرتاپ کو دیکھا تھا
اور صرف ایک بار اُسکی امرت کی سی باتیں سنی تھیں مگر برجن کی شیریں بیانیوں نے اُسکے
سینہ میں آگ کی وہ چنگاری ڈال دی تھی جو شعلوں کے ترنگ میں اُٹھ اُٹھ کر اسے جلا کر خاکستر
کر دیتی۔ پرتاپ چند نہیں ہے مگر مادھوی اسکی تصویر محبت سے دل سے لگائے جاتی ہے
اس دن سے ایسا کوئی برت نہیں تھا جو مادھوی نہ رکھتی ہو کوئی ایسا دیوتا نہیں تھا جسکی
ڈیوڑھی پر حاضری نہ دی ہو اور سب اس لئے کہ پرتاپ چند جہاں کہیں بھی ہو خیریت سے رہے۔
ان تپسیاؤں نے اس لڑکی کو اور بھی زیادہ متین، نیک مزاج اور شرمیلا بنا دیا۔ شاید اُس نے
دل میں فیصلہ کیا تھا کہ میرا بیاہ پرتاپ چند سے ہو چکا۔ برجن اسکی یہ حالت دیکھتی اور روتی کہ
یہ آگ میری ہی لگائی ہوئی ہے۔ اب کل تو یوں کیسے کٹے گی۔ وہ کسکی ہو کر رہے گی!
جس بیج کو میں نے اتنی محنت سے اُگایا اور شہد اور دودھ سے سینچا۔ اُس کا پھول اسطرح
شاخ پر کملایا جاتا ہے۔ برجن تو خیر شعر و سخن میں اُلجھی رہتی۔ یہی باغیچہ اُس کا ہمدم اور
یہ پودے اس کے مونس تھے مگر مادھوی کو یہ شغلہ کہاں۔ اُس کا مونس اور ہمدم صرف خیال
یا تھا۔ اُس کا یار جیا تک اُسکے لئے بیگانہ محض تھا۔ ایک روز پرتاپ کے چلے جانے

کے بعد مادھوی نے خواب دیکھا کہ وہ سنیاسی ہوگیا ہے۔ آج مادھوی کا اتھاہ
پریم ظاہر ہوتا۔ اُسے ابہام سا ہوگیا کہ پرتاپ نے ضرور سنیاس لے لیا۔ آج سے
وہ بھی تپسونی بن گئی۔ ذاتی آرام و آسائش کا خیال دل سے جاتا رہا۔

جب کبھی بیٹھے بیٹھے مادھوی کا جی بہت گھبراتا تو وہ پرتاپ چند کے گھر جا بیٹھتی
وہاں اُسکے دل کو ذرا دیر کے لئے تسکین ہوجاتی تھی۔ جب سے سُواما کو برجن کے خطوط کا پتہ
ملا تھا۔ اُسکی زندگی نے عجیب روش اختیار کرلی تھی۔ غرور و حشمت اُسکے اوصاف کا رکن خاص
تھا۔ اس نے اپنی پیشانی پر بل تک نہ آنے دیا تھا۔ بلکہ افسوس و ملال کا ایک لفظ بھی
نہ نکلنے دیا۔ نہ آنکھوں سے حسرت کے آنسو بہنے پائے۔ حسب معمول گھر کا کاروبار کرتی
رہی بلکہ اب وہ کبھی مصروفیت و انہماک کے ساتھ۔ ہاں اب بجائے جمیلہ نفاست شعاری
کے مزاج میں ذرا اعتدالی آگئی تھی۔ یہ مکان مادھوی کے لئے ایک پاک مندر تھا۔ جبتک
برجن اور سُواما کے دلوں میں گانٹھ پڑی ہوئی تھی وہ یہاں بہت کم آتی تھی۔ جب سے ہوکار
برجن کی پاکیزہ شاعری۔ پاکیزہ خیالات اور پاکیزہ طرز زندگی نے دونوں عورتوں کے دلوں
کی گانٹھ کھولدی اور وہ گنگا جمنا کی طرح باہم گلے مل گئیں۔ تو مادھوی کی آمد و رفت بھی
بڑھی۔ سُواما کے اِس دن کے دن بیٹھی رہجاتی۔ اس گھر کی ایک ایک انگل زمین پر اپنے
کی یادگار تھی۔ اسی آنگن میں بالاجی نے کاٹھ کے گھوڑے دوڑائے تھے اور اسی صحن میں
کاغذ کی ناؤ چلتی تھی۔ نادیں تو شاید زمانہ کے بھنور میں پڑکر ڈوب گئیں مگر گھوڑا
اب بھی موجود تھا۔ مادھوی نے اُسکی بوسیدہ ہڈیوں میں جان ڈالدی اور اُسے باغیچہ میں
حوض کے کنارے ایک گلاب کے سایہ میں باندھ دیا۔ یہی کمرہ بالاجی کی آرامگاہ تھا۔
مادھوی اُسے اب اپنے دیوتا کا مندر سمجھتی ہے۔ اسی پلنگ نے بالاجی کو مدتوں تک اپنے

آغوش میں تھپک تھپک کر سلایا تھا۔ مادھوی اب اُسے پھولوں سے سجاتی ہے گیا
پلنگ نے ایسے دن بھی کبھی دیکھے تھے۔ مادھوی نے اس کمرہ کو ایسا آراستہ کر دیا جیسا وہ
کبھی نہ تھا۔ تصویروں کے چہرہ پر سے گرد کا نقاب اُٹھ گیا۔ لیمپ کے نصیب پھر روشن
ہوئے۔ مادھوی کی اس ہمہ گیر محبت سے سُباما کا کفر بھی ٹوٹ گیا۔ مُدت سے اسکی زبان
پر پرتاپ چند کا نام کبھی نہیں آیا تھا۔ برجن سے میل جول بھی ہو گیا مگر دونوں عورتوں میں
کبھی پرتاپ کا ذکر نہیں آیا۔ حیا برجن کی دامنگیر تھی اور خودداری سُباما کی مگر مادھوی
کے شعلۂ محبت نے پتھر کو بھی پگھلا دیا جب وہ ایک خود رفتگی کے عالم میں پرتاپ کے
بچپنے کی باتیں پُوچھنے لگتی تو سُباما سے ضبط نہ ہوتا۔ اُس کی آنکھیں بھر آتیں۔ تب
دونوں دونوں روتیں اور دن دن بھر اُنکی باتیں ختم نہ ہوتیں۔ کیا اب بھی مادھوی کا
حال دل سُباما سے چھپ سکتا تھا۔ وہ اکثر سوچتی کہ کیا یہ تپسوانی یوں ہی محبت کی
آگ میں جلتی رہیگی اور بلا کسی امید کے!

آٹھ نو سال بیت گئے۔ ایک دن برج رانی نے کملا کا پیکٹ کھولا تو سرورق
پر ایک نہایت پُر جلال تصویر کئی رنگوں میں بنی ہوئی نظر آئی۔ یہ کسی مہاتما کی تصویر تھی۔
اُسے خیال آیا کہ میں نے ان مہاتما کو کہیں ضرور دیکھا ہے۔ سوچتے سوچتے یکایک
اُسکا خیال پرتاپ چند تک جا پہنچا۔ فرط مسرت سے اُچھل پڑی اور بولی:۔ مادھوی
ذرا یہاں آ جاؤ"۔

مادھوی پھولوں کی کیاریاں سینچ رہی تھی۔ اُس کے دل بہلاؤ کا آجکل یہی مشغلہ
تھا۔ ساڑی پانی میں لت پت۔ سر کے بال بکھرے۔ ماتھے پر پسینہ کی بوندیں۔ آنکھوں میں
پریم کا رس۔ آ کر کھڑی ہو گئی۔ برجن نے کہا" آ تجھے ایک تصویر دکھاؤں"

مادھوی ۔ کسکی تصویر ہے ۔ دیکھوں ۔

مادھوی نے تصویر کو بغور دیکھا اور آبدیدہ ہوگئی ۔

برجن ۔ پہچان گئی ۔

مادھوی ۔ کیوں ؟ یہ شکل میں کئی بار خواب میں دیکھ چکی ہوں چہرے سے تیج برس رہا ہے

برجن ۔ دیکھو کچھ حالات بھی لکھے ہیں ۔

مادھوی نے دوسرا ورق الٹا تو "سوامی بالاجی" کی سرخی نظر آئی ۔

تھوڑی دیر تک دونوں خاموش ۔ محویت کی تصویر بنی ہوئی یہ مضمون پڑھتی رہیں ۔ بعد ازاں بات چیت ہونے لگی ۔

برجن ۔ میں تو پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ انہوں نے ضرور سنیاس لے لیا ہوگا

مادھوی زمین کی طرف تاکتی رہی منہ سے کچھ نہ بولی ۔

برجن ۔ تب میں اور اب میں کتنا فرق ہے ؟ چہرہ پہ چالیس برس ہوئے تب ایسے دیکھے نہ تھے ۔

مادھوی ۔ ہوں ۔

برجن ۔ ایسے آنکھ ملا کے ترت تپسیا کی ہے (آبدیدہ ہوکر) کیا اتفاقات ہیں ہم اور وہ ساتھ ساتھ کھیلے ساتھ ساتھ پلے آج وہ سنیاسی ہیں اور میں بیراگن ۔ نہ جانے انہیں ہم لوگوں کی کچھ سدھ بدھ ہے یا نہیں جب سنیاس لے لیا اسے کسی سے کیا ناطہ جی کے پاس ایک خط نہ لکھا تو بھلا ہماری یاد کیا باقی ہوگی مادھوی ! بچپنے میں وہ کبھی جگی جگی کھیلتے تو میں مٹھائیوں کی بھکشا دیا کرتی تھی ۔

مادھوی نے رو کر کہا "نہ جانے کب درشن ہوں گے" ۔ یہ کہکر شرم سے سر جھکا لیا ۔

برجن۔ آئینگے جلد۔ راجہ دھرم سنگھ اور بھیا دونوں انہیں ضرور لائینگے
مادھوی۔ ان دونوں آدمیوں نے بھی بڑے حوصلے کا کام کیا ہے۔
برجن۔ کیسا کچھ! راجہ صاحب یہاں سیر کرنے گئے تھے۔ شاید خطاب کی آرزو کھینچ لے گئی تھی۔ اُنکی جائداد دو ڈھائی کروڑ سے کم کی نہیں۔ پچاس لاکھ تو سالانہ نفع ہے۔ اُن کا اس فراخدلی سے ساری جائیداد کار خیر میں وقف کر دینا اور اس کے ساتھ اپنی زندگی بھی ایسی کر دینا بڑا بھاری تیاگ ہے۔ بھیا نے بھی کل کا نام روشن کر دیا۔ مجھے اُنکی طرف سے ایسی اُمید نہ تھی۔
مادھوی۔ چندرا بہن آتی ہونگی
برجن۔ ہاں اب یہاں کیا کرینگی۔ انہیں بھیا کا یہ کام شاید ہی پسند آیا ہو۔ جھلاتی ہوئی آتی ہوں گی۔
مادھوی۔ درشنوں کو لوگ بہت دُور دُور سے آئے تھے۔
برجن۔ تقریر کی کیسی تعریف کی ہے۔ اُنکی زبان میں تو پہلے ہی جادو تھا اب کیا پوچھنا بھیا کے دل پر جسکی تقریر کا ایسا اثر ہو۔ وہ ساری دنیا پر اپنا جادو پھیلا سکتا ہے۔
مادھوی۔ چلو چچی کے یہاں چلیں
برجن۔ ہاں ان کا تو خیال ہی نہیں۔ دیکھیں کیا کہتی ہیں خوش تو کیا ہونگی۔
مادھوی۔ اُنکی تو بھلا لکھا ہی یہ تھی۔ خوش کیوں نہ ہونگی۔
برجن۔ چل۔ ماں یہ خبر سُنکر کبھی نہیں خوش ہو سکتی۔
دونوں عورتیں گھر سے باہر نکلیں۔ دونوں حسن کی رانی تھیں۔ برجن کو دیکھکر اکثر آدمی سر تعظیم خم کرتے تھے۔ لوگ فرط ادب سے اُسکے سامنے سے ہٹ جاتے۔

خاص و عام میں اس کی یکساں عزت تھی۔

کوئی مادھوی سے پوچھے تیرے پیر اب زمین پر کیوں نہیں پڑتے۔ تیرے زرد چہرے پر کیوں مسرت کی سُرخی جھلکا کرتی ہے۔ تجھے کونسی دولت مل گئی۔ تو اب متفکر و مغموم نہیں نظر آتی۔ تجھے اپنے پیتم سے ملنے کی اب کوئی اُمید نہیں۔ تجھ پر محبت کی نگاہیں کبھی نہیں پڑیں۔ تیرے کانوں میں محبت کی آوازیں کبھی نہیں پہنچیں پھر تو کیوں پھولی نہیں سماتی۔ اس کا جواب مادھوی کیا دیگی۔ کچھ نہیں۔ وہ سر جھکا لیگی اور اُس کی آنکھیں نیچے جُھک جائینگی جیسے ڈالیاں پھولوں کے بوجھ سے جھک جاتی ہیں۔ شاید آنسو کے چند قطرے ٹپک پڑیں مگر اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلیگا۔

مادھوی محبت کے نشہ سے متوالی ہے۔ اس کا دل دیوانۂ محبت ہے۔ اُسکی محبت بازار کا سودا نہیں۔ اسکا پریم کسی چیز کا بھوکا نہیں۔ وہ محبت کے عوض محبت نہیں چاہتی اُسے ناز ہے کہ ایسے پاک منش آدمی کی صورت میرے دل میں جلوہ گزیں ہے، اور یہی اسکی دیوانگی۔ اُس کے پریم۔ اُس کے عشق کا صلہ ہے۔

دوسرے مہینہ میں برج رانی نے بالاجی کے خیر مقدم میں ایک پُر زور نظم لکھی۔ یہ شاعرانہ معجزہ تھا۔ جب یہ نظم شائع ہوئی تو ملکی دنیا باوجودیکہ برجن کی روزافزوں بلند پروازیوں سے مانوس ہونے کے حیرت میں آ گئی۔ وہ طائر فکر جو شاعری کے آسمان میں کرہ ہوا سے بھی آگے نکل جاتا۔ ایک تارا بنکر چمکا۔ ایک ایک شعر الہامی روشنی سے منور تھا۔ جن لوگوں نے وہ نظم پڑھی بالاجی کے فدائی ہو گئے۔ شاعر وہ شعبدہ باز ہے جسکی پٹاری میں بجائے سانپوں کے دل بند ہوتے ہیں:

تاریخ کا ایک ورق

ناظرین۔ بالاجی کے قومی کارنامے آپ کو تاریخ کے صفحوں میں آبِ زر سے لکھے ہوئے ملینگے۔ ہم نے ان صفحات میں اُن حالات اور واقعات کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ تذکرہ کیا ہے جو اس کارنامے کے محرک ہوئے۔ کسی گری ہوئی قوم کو اُبھارنا بہت مشکل کام ہے۔ مگر اس کا صلہ بھی ساری دُنیا کی دولت سے زیادہ گرانبہا اور بیش قدر ہوتا ہے۔ بالاجی کے نام پر آج مورخ کا قلم وجد کرنے لگتا ہے۔ شعراء اُسکے نام پر بلند پروازیوں کے موتی نثار کرتے ہیں۔ ملک کے در و دیوار اُس کا جس گا رہے ہیں۔ اُس کا ذکر آتے ہی لوگوں کے سر تعظیم سے جھک جاتے ہیں اور دل قومی جوش سے لبریز ہو جاتے ہیں۔

کسی گری ہوئی قوم کو اُبھارنا آسان کام نہیں مگر اُسکا صلہ جنت کی نعمتوں سے بھی زیادہ حیات بخش ہوتا ہے۔ بچہ ماں کی گود میں بالاجی کے کارنامے سُنتے ہیں اُسکی یاد دلوں میں حوصلہ اور بازوؤں میں قوت پیدا کر دیتی ہے۔ اسکے نام سے بستیاں بس رہی ہیں اور درسگاہیں کھل رہی ہیں۔ اس کے نام پر زبانیں فصاحت کے پھول چڑھاتی ہیں۔ امرا اپنے محلوں میں اور غربا اپنے جھونپڑوں میں اس کے گن گاتے ہیں۔ اُسکی صورت آنکھوں سے نہیں اُترتی۔ اُسکی پُر زور اور پُر حوصلہ آواز ابتک کانوں میں گونج رہی ہے اُسکے خیالات آئندہ نسلوں کے دماغوں کو سنواریں گے اور صدیوں تک اُس کے ہم وطنوں کے لئے گنبدِ نور کا کام دینگے۔

دیکھئے ایک بے یار و مددگار شخص قوم کو اُبھارنے میں کہاں تک کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس کام کے راستہ میں دولت کی اور مددگاروں کی کمی حائل نہیں ہو سکتی۔ روحانی قوت۔ دردمندی۔ وسیع ہمدردیاں۔ یہ ضروری سامان ہیں۔ ابھی بہت دن نہیں گذرے کہ پرتاپ چند ایک گمنام آدمی تھا۔ آج اُسکا نام بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔ کیا اُسکے پاس قارون کا خزانہ تھا! پنگھٹ پر جب عورتیں کو تھوں پر گھڑے رکھے پانی کے لئے آتی ہیں۔ تب بالاجی ہی کے چرچے ہوتے ہیں اور انہیں کے جس گائے جاتے ہیں۔ اناج کے کھیتوں میں اُنہیں کی بڑائی ہوتی ہے۔ یہی قومی خدمت گذاری کا انعام ہے۔ کلکتہ میں جب وہ گئے پھولوں کی برکھا ہوئی۔ بڑا ربعل من پھول پیروں تلے روندڈالے گئے۔ اُس دن مندروں میں دیوتاؤں کو پھولوں کی باس نہ ملی۔ رنگین مزاجوں کے گلے میں پھولوں کے گجرے نہ دکھائی دیئے اور حسینوں کی سیجیں پھولوں سے نہ سجائی جا سکیں۔ مگر بالاجی کو اس نمائش اور دھوم دھام سے مطلق دلچسپی نہ ہوئی۔ دوسرے دن جب وہ بھاگیرتھی کے کنارے پانی میں غروب آفتاب کی بہار دیکھ رہے تھے تو کئی عورتیں پانی بھرنے آئیں اور گھڑوں کو پانی میں گھما گھما کر باتیں کرنے لگیں۔

ایک نے کہا:- بہن تو نے سُنا نہیں۔ بالاجی آئے ہیں۔

دوسری بولی:- ہمارے ایسے بھاگ کہاں جو اُن کے درشن ملیں

تیسری بولی:- تو چلنے پر راضی ہو تو میں تیرے ساتھ چلوں۔ وہ آج اپنی گئو شالہ دیکھنے آئینگے کوئی دور ہے۔ مجھے گئوؤں کے لئے کھلی اور دانہ بھی لیجانا ہے ایک پنتھ دو کاج ہو جائیگا۔

چوتھی بولی :۔ ایسے دیوتا کے درشن نہ کرینگی تو بڑا پاپ ہوگا۔ دیکھو جب سے ان کا گئوشالہ کھلا ہے لڑکوں کو دونوں وقت دودھ پینے کو مل جاتا ہے۔ نہیں تو روکھی روٹیوں کو ترستے تھے۔

بالاجی نے یہ باتیں سُنیں اور بھاگیرتھی کے گلنار پانی کی طرح چہرہ سرخ ہو گیا اُنہوں نے گاؤں گاؤں گئوشالے کھلوا دئے تھے۔ اُنکا سدھانت تھا کہ ہماری قومی تباہی اور زوال کا اصلی سبب ہمارا جسمانی ضعف اور ذاتوں کی بیجا تفریق ہے جب ہمارے بچے روکھی روٹیوں کو ترستے ہیں اور دودھ گھی کی خوشبو بھی اُنکے ناک تک نہیں پہنچنے پاتی تو کوئی تعجب نہیں کہ ان کے قویٰ ایسے ضعیف۔ چہرے ایسے پژمردہ اور اعضا ایسے کمزور ہیں۔ بلند ارادے اور اونچے خیالات، جیتے جی سینوں اور مضبوط کلائیوں میں رہا کرتے ہیں۔ جب قوائے جسمانی کا یہ حال ہے تو خیالات کیسے اونچے اڑیں۔ استقلال کہاں سے آئے جرأت کہاں سے پیدا ہو۔ پھول کیسے کھلیں جب جڑ کو غذا نہیں پہنچتی پھل کہاں سے آئیں جب پیڑ سوکھ جاتا ہے زمین کو تر کر دو۔ اُس میں پانس ڈالدو۔ پھر دیکھو کہ کیسے خوشنما اور خوشبودار پھول کھلتے ہیں اور کیسے لذیذ اور رسیلے پھل لگتے ہیں جسمانی ضعف سے زیادہ مہیب قومی دشمن وہ شرمناک حقارت ہے جس سے ہم اپنے بھائیوں کو دیکھتے ہیں۔ ہم نے نیچی اور اونچی ذاتیں مقرر کر رکھی ہیں اور فطرت کے اس زبردست قانون کی خلاف ورزی کر رہے ہیں کہ خلقت بتدریج ترقی کرتی ہوئی اعلیٰ ترمدارج پر پہنچتی ہے۔ آجتک جتنے رشی اور مہاتما ہو گزرے ہیں۔ ان سبھوں نے آریہ ورت سے اس تفریق کے مٹانے کی کوششیں کی ہیں۔ مہاتما بدھ وہ پہلے بزرگ تھے جنہوں نے ہندوؤں کی پیشانی

پر سے اس بے اتفاقی اور ظلم کا داغ مٹانا چاہا اور انہیں بہت کچھ کامیابی ہوئی
اُنکے بعد سری شنکر، سری رامانج، سری چیتن، سری رام کرشن، سری سوامی دیانند
اور سوامی رام تیرتھ سبھی مہاتماؤں نے یہی تعلیم دی کہ اپنے بھائیوں کو اپنا بھائی
سمجھو۔ جاہل بھائی بھی تمہارا بھائی ہے اور نادار بھائی بھی تمہارا بھائی ہے۔ اُسے
حقیر مت سمجھو تمہاری نجات اتفاق سے ہوگی تفریق سے نہیں جو شخص اپنے ہموطنوں پر
حقارت کی نگاہ ڈالتا ہے وہ کبھی ترقی کے زینہ پر نہیں پہنچ سکتا۔ پیارو! جب تک
ایک چمار کے سامنے برہمن سر تعظیم جھکانا نہ سیکھے گا۔ اسوقت تک قوم کی ناؤ ہرگز
نہ پار لگیگی۔ یقین مانو۔ تمہاری ناؤ جگہ سے ایک انگل بھی نہ ٹلے گی۔ تمہارے
ڈانڈے ٹوٹ جائیں گے تمہارے بادبان پھٹ جائیں گے اور تمہارے ملاح
ہانپ ہانپ کر بیدم ہو جائیں گے۔

یہ بالاجی کے خیالات ہیں۔ افسوس ہے کہ اُنکی زندگی نے وفا نہ کی ورنہ وہ
ہندوستان کیلئے کیا کچھ نہ کر جاتے۔ تاہم جو کچھ اُنہوں نے کیا اس پر ہر ایک ہندوستانی
فخر کر سکتا ہے۔ ایسا کونسا گاؤں ہے جہاں بالاجی کا گئوشالہ نہ قائم ہو۔ ہندوستان
کی چپہ چپہ زمین کو انہوں نے اپنے قدموں سے روشن کیا۔ پونا۔ بمبئی۔ مدراس۔ میسور۔ کٹک
گجرات جیسے دور دراز جگہوں میں گھومتے رہے اور اپنی بلند آواز سے سوتی ہوئی
آتماؤں کو جگاتے رہے۔ چھ ہفتہ کی کوشش میں انہوں نے صرف میسور میں کم و بیش تین
ہزار گئوشالے کھلوا دئیے۔ آفتاب کی چمک سے پانی میں بھی ایسی چمک آجاتی ہے۔
کہ آنکھیں نہیں ٹھہرتیں۔ بالاجی کا جوش اور حوصلہ دوسروں کو سرگرم۔ پُرجوش اور
حوصلہ مند بنا دیتا تھا۔ جہاں جہاں بالاجی نے گئوشالے قائم کئے وہاں خود بخود

اکھاڑے بن گئے ہیں ختم کی خوش آنند صدائیں صبح کو مبارکباد دیتی ہیں اور للکار کی پُرجوش آوازیں درختوں کو نیند سے جگاتی ہیں۔

ذات کی باہمی تفریق مٹانے کیلئے انہوں نے جو زبردست کوششیں کیں وہ صفحہ تاریخ کے لئے ہمیشہ باعث ناز رہینگی۔ وہ مبارک گھڑی تھی جب انہوں نے پٹنہ میں "ارجن سبھا" کی بنیاد ڈالی تین سال کے اندر ایسا شاید ہی کوئی شہر یا گاؤں تھا جہاں "ارجن سبھا" کی شاخیں نہ کھُل گئی ہوں۔ یہ انہیں ارجن سبھاؤں کی کوششوں کا پھل ہے کہ آج ہر قصبہ میں نیچی ذاتوں کیلئے جُدا جُدا مدرسے۔ جُدا جُدا بورڈنگ ہاؤس قائم ہیں۔ ارجن سبھا کے ممبران مدرسوں میں تعلیم دیتے ہیں اور ان ذاتوں کے تمدن اور معاشرہ کے عیوب کی اصلاح کرنے میں سرگرم ہیں۔ یہ لوگ گاؤں گاؤں گھومتے ہیں اور ہندو قوم کے مظلوموں کو بیداری کا مژدہ سناتے ہیں۔ اُن سے بھائیوں کی طرح بغلگیر ہوتے ہیں اور اُنکے دلوں میں خودداری کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ مبارک اور روح بخش ہوتا تھا وہ نظارہ جب بالاجی اپنے مظلوم بھائیوں کے ساتھ زمین پر بیٹھکر اُنکا دل اور حوصلہ بڑھانیکی باتیں کرتے تھے۔ آج بالاجی کا نام سُنکر یہ لوگ پھُولے نہیں سماتے ان لوگوں میں اخلاق و عادات کے سُدھارنے کی جو کوشش آپ دیکھتے ہیں۔ یہ بالاجی ہی کی جانفشانیوں کا نتیجہ نیک ہے۔

ہمارے قومی کاموں کا ایسا کوئی جزو نہیں ہے جو بالاجی کی عنایت کا ممنون نہ ہو۔ اُنکا وقت۔ اُنکا دھیان۔ اُنکی سرگرمی اور اُنکا سب کچھ قوم کی خدمت کے لئے وقف تھا۔ وہ قوم کے سرتاج اور قوم کے چاکر دونوں ہی تھے۔

بنارس میں آمد

جب سے شہرت نے برج رانی کو اپنا منظور نظر بنایا تھا اُسکے یہاں ہر دم عورتوں کا جمگھٹ لگا رہتا تھا شہر میں مستورات کی کئی سبھائیں تھیں اُنکے متعلق سارا بوجھ اسی کو اُٹھانا پڑتا۔ اسکے علاوہ دوسرے شہروں سے بھی اکثر عورتیں اُسکی ملاقات کو آتی رہتی تھیں جو تیرتھ جاترا کرنے کے لئے بنارس آتا تھا۔ وہ برجن سے ضرور ملاقات کرتا۔ راجہ دھرم سنگھ نے اُسکے کلام کا مجموعہ بڑی آب و تاب سے شایع کیا تھا۔ اور اس مجموعہ نے اُسکی شاعرانہ سطوت کا ڈنکا بجا دیا تھا ہندوستان کا تو کیا شمار یورپ اور امریکہ کے سربرآوردہ شعرا نے بھی اسکے محاسن کلام پر مبارکباد دی۔ ہندوستان میں شاید ہی ایسا کوئی خوش مذاق شخص ہوگا جسکی کتابوں کا طاق اس دیوان سے آراستہ نہ ہو اور برجن کے کلام کی قدر کرنے والوں میں بالا جی کا درجہ سب سے بڑھا ہوا تھا۔ وہ اپنی پُر زور تقریروں اور تحریروں میں اُسی کے کلام کی سندیں دیا کرتے تھے۔ اور ایکبار سرسوتی میں اُسکی پُر زور تنقید لکھی تھی۔

ایکروز برجن صبح کے وقت بیٹھی ہوئی تھی کہ سیتا۔ چندر کنور۔ رکمنی اور رانی آئیں۔ چندر کنور زیوروں سے لدی ہوئی تھی۔ سیتا متین اور خاموش۔ رکمنی کا چہرہ پژمردہ۔ الوداع شباب کی تصویر اور رانی ناک چوٹی سے درست۔ عطر میں ڈوبی ہوئی۔ چندر انے ان عورتوں کو فرش پر بٹھایا اور اُنکی خاطر مدارت کی۔ برجن

نے صبح کا وقت فکرِ سخن کے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ اسوقت وہ بلا کسی ضرورت
کے سکھیوں سہیلیوں سے نہ ملتی جلتی تھی۔ باغیچہ میں ایک خوبصورت کنج تھا۔ گلاب کی
خوشبو سے بسی ہوئی ہوائیں آتی تھیں۔ وہیں برجن ایک قالین پر بیٹھی ہوئی فکرِ سخن
کیا کرتی تھی اور بحرِ معنی سے جو موتی وہ نکالتی اسے مادھوی سلک قلم میں پرو دیا کرتی
آج بہت دنوں کے بعد اہلِ شہر کے متواتر تقاضوں پر برجن نے بالاجی کو بنارس میں
آنے کی دعوت دینے کے لئے قلم اُٹھایا تھا۔ بنارس ہی وہ شہر تھا جسکی یاد کبھی کبھی بالاجی
کو بے چین کر دیا کرتی تھی مگر باوجود اہلِ بنارس کے مسلسل دعوت اور اصرار کے انہیں
بنارس آنے کی کبھی فرصت نہ ملی بیلون اور ننگون تک گئے مگر بنارس کی طرف رُخ
نہ کیا۔ اس شہر کو وہ امتحان کدہ سمجھا کرتے تھے۔ اسی لئے آج برجن انہیں بنارس آنے
کی دعوت دے رہی ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دعوت انہیں ضرور کھینچ لائیگی۔ جب
کوئی تازہ خیال آجاتا ہے تو برجن کا چاند سا چہرہ چمک اُٹھتا ہے اور مادھوی کے
چہرہ پر سُرخی کی جھلک آجاتی ہے۔ باغیچہ میں گلاب کے بہت پھول کھلے ہیں۔ رات کی
شبنم میں نکھر کر وہ اسوقت بہت سہانے معلوم ہوتے ہیں مگر اسوقت جو تازگی اور
سُہانا پن ان دونوں پھولوں پر ہے اُسے دیکھ دیکھ کر دوسرے پھول شرمائے جاتے
ہیں۔ دونوں پھول باغِ فردوس کے پھول ہیں۔

مگر نہیں۔ ہم بھولتے ہیں۔ ایسے حسنِ دلآویز کو پھول سے کیا نسبت۔ پھول میں
وہ دلآویزی کہاں۔ وہ رس کہاں۔ وہ کشش کہاں۔ کسی نے ایسا پھول دیکھا ہے جسے
دیکھنے سے کبھی آنکھیں آسودہ نہ ہوں اور دیکھنے کی ہوس باقی رہے۔ ایسا پھول
کہاں ہے جسے دیکھکر دل پر ایک بجلی سی کوند جائے جسکی صورت دل پر نقش ہو جائے

شعراء نے پھول کا رتبہ بڑھا رکھا ہے۔ پھر کیا اس حسن کو چاند سے تشبیہ دیں؟ آہ! یہاں بھی شاعروں نے ٹھوکر کھائی ہے۔ چاند میں وہ دلفریبی کہاں۔ چاند میں روشنی ہے۔ چمک ہے مگر حسن کہاں۔ کیا چاند بھی ایسی چیز ہے جسے دیکھنے سے جی نہ بھرے کیا چاند بھی جگر کو مسوسنے لگتا ہے۔ کیا چاند کو دیکھ کر بھی روح پر ایک نشہ سا ہو جاتا ہے۔ حق یہ ہے کہ حسن کی تشبیہ دنیا کی کسی چیز سے نہیں دی جا سکتی۔ کسی چیز میں یہ کشش یہ اثر۔ یہ دلآویزی نہیں۔

نو بجتے بجتے برجن کمرہ میں آئی۔ سیوتی بولی: "آج بڑی دیر لگائی"۔

برجن۔ کنتی نے سورج کے بلانے کے لئے کتنی تپسیا کی تھی۔

سیتا۔ بالاجی بڑے نٹھر ہیں۔ میں تو ایسے آدمی سے کبھی نہ بولوں۔

رکمنی۔ جس نے سنیاس لے لیا اُسے گھر بار سے کیا ناطہ۔

چندر کنور۔ یہاں آئینگے تو میں منہ پر کہہ دونگی کہ حضرت یہ معشوقانہ انکار کہاں سیکھا؟

رکمنی۔ مہارانی رشی مہاتماؤں کا تو ادب کیا کرو۔ زبان کیلئے کترنی ہے؟

چندر کنور۔ اور جنہیں کہئے صبر کریں جی۔ سب جگہ جاتے ہیں یہیں آتے پیر تھکتے ہیں۔

برجن (مسکراکر) اب بہت جلد درشن پاؤگی مجھے یقین ہے کہ اس مہینہ میں وہ ضرور آئینگے

سیتا۔ دھنیہ بھاگ کہ درشن تو ملیں گے۔ میں تو جب اُنکا حال پڑھتی ہوں تو یہی جی چاہتا ہے کہ پا جاؤں تو پیر پکڑ کر گھنٹوں روؤں "

رکمنی ایشور نے اُن کے ہاتھوں میں بڑا جس دیا ہے دارانگر کی رانی صاحبہ مر ہی چکی تھیں۔ یقینی مانو دم ٹوٹ رہا تھا۔ کہ بالاجی کو خبر ہوئی۔ فوراً پہنچے اور دم کی دم میں اُٹھا کر بٹھا دیا۔ ہمارے منشی جی (شوہر) ان دنوں وہیں تھے۔

کہتے تھے کہ رانی جی نے خزانہ کی کنجی لیکر بالاجی کے پیروں پر رکھدی اور کہا آپ اسکے مالک ہیں۔ بالاجی نے خزانہ کی کنجی نہ لیکر کہا مجھے خزانہ درکار نہیں آپ اپنی ریاست میں تین سو گئو شالے کھلوا دیجئے۔ زبان سے نکلنے کی دیر تھی آج داما نگر میں دودھ کی ندی بہتی ہے۔ ایسا مہاتما کون ہوگا۔

چندر کنور۔ رلیعہ نولکھا کا تپ دق انہیں کی بوٹیوں سے چھوٹا۔ سارے حکیم ڈاکٹر جواب دے چکے تھے جب بالاجی چلنے لگے تو مہارانی صاحبہ نے نولاکھ کا موتیوں کا ہار ان کے پیروں پر رکھدیا۔ مگر اُسکی طرف دیکھا تک نہیں۔

رانی۔ عجیب مُردہ طبیعت کے ہیں۔

رکمنی۔ ہاں اور کیا۔ انہیں چاہیئے تھا کہ ہار لے لیتے بلکہ گلے میں ڈال لیتے

برجن نہیں لیکر رانی کو پہنا دیتے۔ کیوں سکھی؟

رانی۔ ہاں میں اُس ہار کے لئے غلامی لکھدیتی۔

چندر کنور۔ ہمارے یہاں تو ارجن سبھا کے ممبرن بیٹھے ہیں۔ ڈھائی سو روپیہ لاکھ جتن کر کے رکھ چھوڑا تھا۔ اسے اٹھا لیگئے۔ کہ گھوڑا لیں گے۔ کیا ارجن دا بالا گھوڑے کے نہیں چلتے۔

رانی۔ کل یہ لوگ قطار باندھکر میرے مکان کے سامنے سے جا رہے تھے۔ بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا

اسی اثنا میں سیوتی تازہ اخبار لائی۔

برجن۔ کوئی نئی خبر ہے؟

سیوتی۔ ہاں بالاجی مانکپور آئے ہیں۔ ایک اہیر نے اپنی لڑکی کی شادی کا نوید بھیجا

تھا اس پر الہ آباد سے ارجن سبھا کے ممبروں کے ساتھ راتوں رات مانکپور پہنچے۔ انہوں نے بڑے جوش سے خیر مقدم کیا۔ اور ملکہ پانچسو گائیں انہیں بھینٹ دی ہیں۔ مہاراج نے دلہن کو دعا دی اور دولہا کو گلے لگایا۔ پانچ امیر ارجن سبھا کے ممبر بنائے گئے۔

برجن۔ نہایت دلچسپ خبر ہے۔ مادھوی اسے کاٹ کر رکھ لینا۔ اور کچھ؟

سیوتی۔ پٹنہ کے باسیوں نے ایک ٹھاکر دوارہ بنوایا ہے۔ پٹنہ کی ارجن سبھا نے بڑے دھوم دھام سے اس کا جلسہ کیا۔

برجن۔ پٹنہ کے لوگ خوب سرگرمی سے کام کر رہے ہیں

چندر کنور۔ کیا سوریں بھی اب سیندور پہنیں گی۔ باسی ٹھاکر دوارے بنوائینگے

رکمنی۔ کیوں وہ آدمی نہیں ہیں۔ ایشور نے انہیں نہیں بنایا۔ آپ ہی اپنے مالک کی پوجا کرنا جانتی ہیں۔

چندر کنور۔ چلو ہٹو باسیوں سے مجھے ملاتی ہو۔ یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔

رکمنی۔ ہاں تمہارا رنگ ذرا صاف ہے اور گہنے کپڑے سے لیس ہو۔ بس اتنا ہی فرق ہے کہ اور کچھ

چندر کنور۔ اتنا ہی فرق کیوں ہے۔ زمین کو آسمان سے ملاتی ہو۔ میں کچھوا ہوں کے خاندان میں ہوں۔ معلوم ہے۔!

رکمنی۔ ہاں معلوم ہے اور نہیں معلوم تھا تو اب معلوم ہو گیا۔ ٹھاکر صاحب کبھی باسی سے بدبد کر کشتی لڑینگے؟ یا سر پر ٹیڑھی پگیا ہی رکھنا جانتے ہیں۔ میں تو جانتی ہوں کہ کوئی معمولی باسی بھی انہیں بغل میں دبالیگا۔

چندرکنور۔ منہ میں زبان ہے جو چاہے کہہ لو۔ ہمارے باوا جے پور میں صوبہ دار تھے ہملوگوں کی بیرتا دُنیا میں مشہور ہے۔

برجن۔ اچھا اب اس قضیہ کو جانے دو۔ تم دونوں جب آتی ہو لڑتی ہی آتی ہو۔

ایک مہینہ اور گذرا۔ برجن کی تازہ نظم خیر مقدم کا پیغام لیکر بالاجی کے پاس پہنچی مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ اُنہوں نے دعوت قبول کی یا نہیں۔ اہل بنارس راہ دیکھتے دیکھتے تھک گئے۔ بالاجی روز بروز دکھن کی طرف بڑھتے جاتے تھے۔ آخر لوگوں کو مایوسی ہو گئی اور سب سے زیادہ مایوسی برجن کو ہوئی۔

ایک روز جب کسی کو شان و گمان بھی نہ تھا کہ بالاجی بنارس آئینگے۔ پران ناتھ نے آکر کہا۔ "بہن لو خوش ہو جاؤ۔ آج بالاجی تشریف لا رہے ہیں"۔

برجن کچھ لکھ رہی تھی۔ ہاتھ سے قلم چھوٹ پڑا۔ مادھوی اُٹھ کر دروازہ کی طرف لپکی۔ پران ناتھ نے مسکرا کر کہا ابھی آ تھوڑے ہی گئے کہ یوں بے صبر ہوئی جاتی ہو۔

مادھوی۔ کب آئینگے؟ اِدھر ہی سے ہو کر جائینگے نا؟

پران ناتھ۔ یہی تو نہیں معلوم کدھر سے آئینگے۔ انہیں جلوس اور دھوم دھام سے سخت نفرت ہے۔ اسی لئے پہلے سے آنے کی تاریخ نہیں مقرر کی۔ راجہ صاحب کے پاس آج صبح کو ایک آدمی نے آکر خبر دی کہ بالاجی آرہے ہیں اور کہا تھا کہ میرے استقبال کے لئے دھوم دھام نہ ہو۔ مگر یہاں بنارس کے لوگ اسے کب مانتے ہیں۔ استقبال ہوگا اور دھوم دھام کیساتھ جلوس نکلیگا اور ایسا شاندار کہ شہر کی تاریخ میں یاد رکھنے کے قابل۔ چاروں طرف آدمی چھوٹے ہوئے ہیں کہ جوں ہی انہیں آتے دیکھیں ہر ایک محلہ میں ٹیلیفون سے خبر پہنچا دی جائے

کالج اور اسکول کے طلباء وردیاں پہنے بیرکیں لئے اشارہ کے منتظر ہیں۔ گھر گھر پھول برسانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بازار میں دکانیں سجائی جا رہی ہیں شہر میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی ہے۔

مادھوی۔ اِدھر سے جائینگے تو ہم اُنہیں روک لیں گے۔

پران ناتھ۔ ہم نے کوئی تیاری تو کی ہی نہیں۔ روک کیا لینگے۔ اور یہ بھی تو نہیں معلوم کہ کدھر سے جائینگے۔ مادھاچرن نے دھوکا دیا۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ میں امرتسر کی طرف سے اُن کے آنے تک لوٹ آؤنگا اور ابھی تک اُنکا کہیں پتہ نہیں۔ خیر۔

برجن۔ دسو چکر، آرتی اُتارنے کا انتظام تو کرنا ہی ہوگا۔

پران ناتھ۔ ہاں اب کیا اتنا بھی نہ ہوگا۔ میں باہر فرش وغیرہ بچھواتا ہوں۔

پران ناتھ باہر تیاریوں میں مصروف تھے۔ مادھوی پھول چُننے لگی۔ برجن نے رو پہلا تھال دھو دھا کر صاف کیا۔ سیوتی اور چندرا اندر سب چیزیں قرینہ سے رکھنے لگیں۔

مادھوی خوشی کے مارے پھولی نہ سماتی تھی۔ بار بار چونک کر دروازہ کی طرف دیکھتی کہ کہیں وہ آ تو نہیں گئے۔ بار بار کان لگا کر سُنتی کہ کہیں باجے کی آوازیں تو نہیں آ رہی ہیں۔ دل مارے خوشی کے دھڑک رہا تھا۔ پھول چُنتی تھی مگر دھیان دوسری طرف تھا۔ ہاتھوں میں کتنے ہی کانٹے چُبھا لئے۔ پھول کے ساتھ کئی پیڑوں کی شاخیں مروڑ ڈالیں۔ کئی دفعہ شاخوں میں اُلجھکر گری۔ کئی دفعہ ساڑی کانٹوں میں پھنسا دی۔ اسوقت اسکی حالت بالکل بچوں کی سی تھی۔

مگر برجن کا چہرہ بالکل اداس تھا۔ جیسے بھرا ہوا پیالہ ذرا سا ہلنے سے بھی چھلک پڑتا ہے۔ اُسی طرح جوں جوں پرانی باتیں یاد آتی تھیں اُسکی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے تھے۔ آہ کبھی وہ دن تھے کہ ہم اور وہ بھائی بہن تھے۔ ساتھ کھیلتے تھے۔ ساتھ رہتے تھے یا آج سولہ سال گزر گئے اُنکی صورت دیکھنی بھی نصیب نہ ہوئی تب میں ذرا بھی روتی تو وہ میرے آنسو پونچھتے اور میرا دل بہلاتے۔ اب اُنہیں کیا خبر کہ یہ آنکھیں کتنا روئی ہیں اور اس دل نے کیسے کیسے صدمے اُٹھائے ہیں کیا خبر تھی کہ ہماری قسمتیں ایسے گل کھلائینگی۔ ایک بیوگن ہو جائیگی اور دوسرا سنیاسی

یکایک مادھوی کو خیال آیا کہ بپا ماکو شاید بالاجی کے آنے کی خبر نہ ہوئی ہو۔ برجن کے پاس آکر بولی "بہن ذرا میں چچی کے یہاں جاتی ہوں۔ نہ جانے کسی نے ان سے کہا یا نہیں۔

پران ناتھ باہر سے آرہے تھے۔ یہ سنکر بولے۔ وہاں سویرے ہی سب سے پہلے خبر ہو گئی خوب تیاریاں ہو رہی ہیں۔ بالاجی بھی سیدھے گھر کی ہی طرف جائینگے۔ ادھر سے اب نہ آئینگے

برجن۔ تو ہم لوگوں کو چلنا چاہیئے۔ کہیں دیر نہ ہو جائے۔

مادھوی۔ آرتی کا تھال لاؤ۔

برجن۔ کون لے چلیگا۔ مہری کو بلالو (چونک کر) ارے یہ تیرے ہاتھوں میں خون کہاں سے آیا؟

مادھوی۔ اُونہہ۔ پھول چنتی تھی۔ کانٹے لگ گئے ہونگے۔

چندرا۔ ابھی نئی ساڑی آئی ہے۔ آج ہی پھاڑ کے رکھدی

مادھوی۔ تمہاری بلا سے۔

مادھوی نے یہ کہہ تو دیا مگر آنکھیں پُر آب ہو گئیں۔ چندرا یوں بہت نیک عورت تھی مگر جب سے بابو رادھا چرن نے قومی خدمت کے لئے نوکری سے استعفا دیا تو بالا جی کے نام سے چڑتی تھی۔ برجن سے تو کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ مادھوی کو چھیڑتی رہتی تھی۔ برجن نے چندرا کی طرف گھور کر مادھوی سے کہا "جاؤ صندوق سے دوسری ساڑی نکال لو اسے رکھ آؤ۔ رام رام مار کے ہاتھ چھلنی کر ڈالا۔"

مادھوی۔ دیر ہو جائیگی۔ میں یوں ہی چلونگی۔

برجن۔ نہیں ابھی گھنٹہ بھر سے زیادہ مہلت ہے۔

یہ کہہ کر برجن نے پیار سے مادھوی کا ہاتھ دھویا۔ اُسکے بال گوندھے۔ ایک خوبصورت ساڑی پہنائی۔ چہار سانٹ عادانی اوڑھائی۔ اور اُسے گلے سے لگا کر پُر آب آنکھوں سے تاکتی ہوئی بولی۔ بہن۔ دیکھو دھیرج ہاتھ سے نہ جائے۔

مادھوی مسکرا کر بولی "تم میرے ہی ساتھ رہنا۔ مجھے سنبھالتی رہنا۔ مجھے اپنے دل پر آج بھروسہ نہیں ہے۔"

برجن سمجھ گئی کہ آج پریم نے مدہوشی کا درجہ اختیار کیا ہے اور شاید یہی اُس کی انتہا ہے۔ آہ! یہ باولی بالو کی دیوار کھڑی کر رہی ہے۔

تھوڑی دیر میں مادھوی۔ برجن۔ سیوتی۔ چندرا کئی عورتوں کے ساتھ سُبا ما کے گھر کو چلیں۔ وہاں کی تیاریاں دیکھیں تو دنگ رہ گئیں۔ دروازہ پر ایک نہایت وسیع شامیانہ کھڑا تھا۔ فرش فروش اور شیشہ و آلات سے آراستہ۔ نوبت جھڑ رہی تھی۔ بڑے بڑے ٹوکروں میں میوے اور مٹھائیاں رکھی ہوئی تھیں۔ شہر کے رؤسائے نامدار خوش وضع لباس پہنے ہوئے استقبال کرنے کو کھڑے تھے۔ فٹن اور گاڑیاں ایک بھی نظر نہ آتی تھیں کیونکہ

بالاجی ہمیشہ پیدل ہی چلا کرتے تھے۔ بہت سے لوگ گلے میں جھولیاں ڈالے ہوئے دکھائی
دیتے تھے جن میں شاید بالاجی پر نثار کرنے کے لئے روپے پیسے بھرے ہوئے تھے۔ راجہ
دھرم سنگھ کے پانچوں لڑکے رنگین کپڑے پہنے زعفرانی صافے باندھے۔ ریشمی جھنڈیاں کمر میں
کھونسے بگل بجا رہے تھے۔ جوں ہی لوگوں کی نظر برجن پر پڑی ہزاروں سر فرطِ ادب سے خم ہوگئے۔
جب یہ خاتونیں اندر گئیں تو وہاں بھی آنگن اور سائبان اور کمرے دلہن کی طرح سجے ہوئے
پائے۔ صدہا عورتیں مبارکباد کے گانے گانے کیلئے بیٹھی ہوئی تھیں۔ پھولوں کے ڈھیر جا بجا پڑے
ہوئے تھے۔ سُبلما ایک سفید ساڑھی پہنے صبر و حلم کی تصویر بنی ہوئی دروازے پر کھڑی تھی
برجن اوّلاد صورتی کو دیکھتے ہی آبدیدہ ہوگئیں۔ برجن لیلی۔ "چچی آج اس گھر کے
بھاگ جاگ گئے"۔ سُبلما نے رو کر کہا۔ "تمہاری بدولت مجھے آج یہ دن دیکھنا
نصیب ہوا ہے ایشور تمہیں اس کا پھل دے"۔

غم نصیب ماں کے تہ دل سے یہ دعا نکلی۔ ایک غم نصیب ماں کی بد دعا نے راجہ
دسرتھ کو بیٹے کے فراق میں شربت مرگ چکھایا تھا۔ کیا سُبلما کی یہ دعا بے اثر رہیگی؟

دونوں ابھی اسی طرح کی باتیں کر رہی تھیں کہ گھنٹے اور ناقوسوں کی صدائیں
آنے لگیں۔ شور مچا کہ بالاجی آپہنچے۔ عورتوں نے مبارکباد گانا شروع کیا۔ مادھوی نے
آرتی کا تھال لے لیا اور راستہ کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ ذرا دیر میں ڈل دی پوش
نوجوانوں کی ایک جماعت نظر آئی۔ اُسکے بعد ارجن سبھا کے اکیس پچیس ممبر گھوڑوں پر
سوار دکھائی دئے۔ اُنکے پیچھے بیشمار آدمیوں کا ہجوم تھا۔ سارا شہر پھٹ پڑا تھا شانے
سے شانے چھل رہے تھے۔ سمندر کی ایک لہر تھی کہ بڑھتی چلی آتی تھی۔ اس ہجوم میں بالا
جی کا چہرہ ایسا نظر آتا تھا جیسے بادل میں سے چاند نکلا ہو۔ پیشانی پر سرخ چندن کا

تلک تھا اور گردن میں گیروے رنگ کی ایک چادر پڑی ہوئی تھی۔

سبھاما دروازہ پر کھڑی تھی۔ جوں ہی بالاجی کا چہرہ اُسے نظر آیا۔ ضبط ہاتھ سے جاتا رہا۔ دروازہ سے باہر نکل پڑی اور سر جھکائے آنکھوں سے موتی برساتی بالاجی کی طرف چلی۔ آج اس نے اپنا کھویا ہوا لال پایا ہے اور اُسے گلے لگانے کیلئے بیقرار ہو رہی ہے۔

سبھاما کو اس طرح آتے دیکھکر سب لوگ رُک گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے کوئی دیوی اُتر آئی ہے۔ چوطرفہ سناٹا چھا گیا۔ بالاجی نے کئی قدم آگے بڑھکر ماں کو پرنام کیا اور اُسکے پیروں پر گر پڑے۔ سبھاما نے اُنکا سر اپنی گود میں لے لیا اور اُنکے ماتھے پر کئی بوسے دئے۔ آج اس نے اپنا کھویا ہوا لال پایا ہے۔ اُس پر آنکھوں سے موتی برسا رہی ہے۔

اس روح افزا نظارہ کو دیکھکر لوگوں کے دل قومیت کے نشہ سے مدہوش ہو گئے۔ پچاس ہزار گلوں سے آواز آئی "بالاجی کی جے" بادل گرجا اور چاروں طرف سے پھول لوٹی برکھا ہونے لگی۔ پھر اُسی طرح گھن گرجکر صدا بلند ہوئی "ستی سالگرام کی جے"۔ اور ہزاروں آدمی حبِّ وطن کے نشہ سے مست ہوکر دوڑے اور سبھاما کے قدموں کی خاک پیشانی پر ملنے لگے۔ ان نعروں سے سبھاما ایسی خوش ہو رہی تھی جیسے مہور کے سننے سے ناگن متوالی ہو جاتی ہے۔ آج اس نے اپنا کھویا ہوا لال پایا ہے۔ اس بے بہا رتن کے ملنے سے وہ رانی ہو گئی ہے اُسی رتن کی بدولت آج اُسکے قدموں کی خاک لوگوں کی آنکھوں کا سرمہ ہے اور ماتھے کا چندن بن رہی ہے۔

عجیب حیات بخش نظارہ تھا بار بار جے جے کار کے نعرے بلند ہوتے تھے۔

اور عالم بالا کے بسنے والوں کو بھارت کی بیداری کا مژدہ سُنا تے تھے۔ ماں اپنے بیٹے کو کلیجے سے لگائے ہوئے ہے۔ بہت دِن کے بعد آج اس نے اپنا کھویا ہوا لال پایا ہے وہ لال جو اسکی جنم بھر کی کمائی تھی۔ پھول چاروں طرف سے نثار ہو رہے ہیں۔ زرد جواہر کی بارش ہو رہی ہے۔ ماں اور بیٹا کمر تک پھولوں کے سمندر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ایسا پُر تاثیر سین کس کی آنکھوں نے دیکھا ہوگا!

سُبا ما بالاجی کا ہاتھ پکڑے ہوئے گھر کی طرف چلی۔ دروازہ پر پہنچتے ہی عورتیں مبارکباد گانے لگیں اور مادھوی سُنہرے تھال میں دُھوپ۔ دیپ پھولوں سے آرتی اُتارنے لگی۔ برجن نے پھولوں کی مالا اُنکے گلے میں ڈالی۔ وہ مالا جسے مادھوی نے اپنے خون سے رنگا تھا۔ بالاجی نے چشم پُرآب سے برجن کی طرف دیکھکر پرنام کیا۔

مادھوی کو بالاجی کے درشن کی کتنی آرزو تھی۔ مگر اس وقت اُسکی آنکھیں زمین کی طرف جھکی ہوئی ہیں۔ بالاجی کی طرف نہیں تاک سکتی۔ اُسے خوف ہے کہ میری آنکھیں دل کا بھید کھولدینگی۔ اُنمیں پریم رس بھرا ہوا ہے۔ آج پہلی بار مادھوی کے دلمیں نئی آرزوئیں پیدا ہوئی ہیں۔ ابتک اُسکی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ بالاجی کے درشن پاؤں مگر آج آرزوؤں نے سر اُبھارا ہے۔ پوری ہونے کے لئے نہیں۔ آج باغ حسرت میں ایک نئی کلی لگی ہے۔ کھلنے کے لئے نہیں بلکہ مُرجھانے کے لئے اور مُرجھاکر خاک میں مل جانے کے لئے۔ مادھوی کو کون سمجھائے کہ تو ان آرزوؤں کو دلمیں نہ پیدا ہونے دے۔ یہ آرزوئیں تجھے بہت رُلائینگی۔ تیری محبّت خیالی ہے۔ تو اُسکے مزے سے واقف ہے۔ کیا اب واقعی محبّت کا مزہ لیا چاہتی ہے

———— * ————

پریم کا سپنا

انسان کا دل آرزوؤں کا کاشانہ ہے اور حسرتوں کی بستی۔ کوئی زمانہ وہ تھا کہ مادھوی ماں کی گود میں کھیلتی تھی۔ اسوقت دل آرزوؤں اور حسرتوں سے خالی تھا۔ مگر جب مٹی کے گھروندے بنانے لگی۔ اسوقت دلمیں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ میں اپنی گڑیا کا بیاہ کروں۔ سب لڑکیاں اپنی گڑیا بیاہ رہی ہیں۔ کیا میری گڑیا کنواری رہیگی۔ میں اپنی گڑیا کو گہنے بنوا دونگی۔ اسکا بیاہ رچاؤنگی۔ اس آرزو نے اُسے مہینوں رلایا۔ مگر گڑیا کی قسمت میں بیاہ نہ بدا تھا۔ ایک روز بادل گھر آئے اور موسلا دھار پانی برسا۔ گھروندا مینہہ میں بہہ گیا۔ اور گڑیا کے بیاہ کی حسرت رہ گئی۔

کچھ دن اور گذرے۔ ماں کے ساتھ برجن کے یہاں آنے جانے لگی۔ اُسکی میٹھی میٹھی باتیں سنتی اور خوش ہوتی۔ اُسکے تھال میں کھاتی اور اُسکی گود میں سوتی۔ اسوقت بھی اس کے دلمیں ایک آرزو تھی کہ میرا خوب اچھا گھر ہوتا۔ اسمیں چاندی کے کواڑ لگے ہوتے۔ زمین ایسی صاف ہوتی کہ مکھی بیٹھے اور پھسل جائے۔ میں برجن کو اپنے گھر لے جاتی وہاں اچھی اچھی چیزیں بناتی اور کھلاتی اور اچھے سے پلنگ پر سُلاتی۔ اور اُسکی خوب سیوا کرتی۔ یہ آرزو برسوں تک دل میں چٹکیاں لیتی رہی۔ مگر اُسی گھروندے کی طرح یہ گھر بھی ڈھے گیا۔ اور آرزوئیں مبدل بہ حسرت ہو گئیں۔

کچھ دن اور گذرے۔ بہار کے دن آئے۔ برجن نے اُسکے دل پر پرتاپ چند

کی تصویر کھینچنی شروع کی۔ ان دنوں اس ذکر کے سوا کوئی بات اچھی نہ لگتی۔ آخر پرتاپ چند کی چہیری بننے کی آرزو دل میں پیدا ہوئی۔ لیٹے لیٹے دل سے باتیں کیا کرتی۔ راتوں کو جاگ جاگ کر سن کی مٹھائی کھاتی۔ ان خیالوں سے دل پر ایک نشہ سا ہو جاتا مگر پرتاپ چند اسی اثنا میں لاپتہ ہو گئے۔ اور اسی مٹی کے گھروندے کی طرح یہ ہوائی قلعے بھی ڈھے گئے۔ آرزوؤں کی جگہ دل میں حسرتیں رہ گئیں۔

اب حسرتوں کے ہجوم سے دل میں آرزوؤں کی جگہ باقی نہ رہی۔ دیوتاؤں کی اُپاسنا کرنے لگی۔ برت رکھنے لگی تاکہ پرتاپ چند پرماتما کی بھی نگاہ نہ ٹلے اس طرح ایک مدت تک اُس نے بیسوئی کی زندگی بسر کی۔ خیال محبت کے نشے میں چور رہتی۔ مگر آج تپسوئی کا برت ٹوٹ گیا اور دل میں نئی آرزوؤں نے سر اُٹھایا۔ برس سال کی تپسیا ایک لمحہ میں بھنگ ہو گئی۔ کیا یہ آرزوئیں بھی اسی مٹی کے گھروندے کی طرح پامال ہو جائیں گی؟

آج جب سے مادھوی نے بالاجی کی آرتی اتاری ہے اُسکے آنسو نہیں تھمتے سارا دن گزر گیا اور ایک ایک کر کے تارے نکلنے لگے۔ سورج تھک کر چھپ گئے اور چڑیاں تھک کر گھونسلوں میں آ بیٹھیں۔ مگر مادھوی کی آنکھیں نہیں تھکیں۔ وہ سوچتی ہے کہ ہائے! کیا میں اسی طرح رونے کے لئے بنائی گئی ہوں۔ میں کبھی ہنستی بھی تھی کہ جسکے بدلے اتنا روتی ہوں۔ آہ۔ روتے روتے آدھی عمر گزر گئی۔ کیا یہ باقی دن بھی یوں ہی کٹیں گے۔ کیا میری زندگی میں ایک دن بھی ایسا نہ آئیگا جسے یاد کر کے تسکین ہو۔ کہ میں نے کبھی اچھے دن دیکھے تھے۔ آج سے پہلے مادھوی کبھی ایسی یاس زدہ اور شکستہ خاطر نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنی خیالی محبت میں محو تھی آج

اسکے دل میں نئی آرزوئیں پیدا ہوئی ہیں۔ اور یہ آنسو انہیں کے کرشمے ہیں جن دل سولہ برس سے تک حسرتوں کی آرامگاہ رہ چکا ہو وہی اس وقت مادھوی کے خیالات کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

سُبامالی کے دل میں بھی آج نئی آرزوؤں نے سر اُبھارا تھا جب تک بالاجی کو نہ دیکھا تھا سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ ایک نظر دیکھ کر کلیجہ ٹھنڈا کر لیتی۔ آج جب ایک نظر دیکھ لیا تو کچھ اور دیکھنے کی ہوس پیدا ہوئی مگر افسوس مادھوی کے گھونسلے کی طرح خاک میں مل جانے کے لئے۔

آج سُباما۔ برجن اور بالاجی میں شام تک باتیں ہوتی رہیں۔ بالاجی نے اپنے تجربات بیان کئے۔ سُباما نے اپنی رام کہانی سنائی اور برجن نے کہا تھوڑا سا بہت۔ منشی سنجیون لال کے سنیاس کی خبر پاکر دونوں روئیں۔ جب چراغ جلنے کا وقت آپہنچا تو بالاجی گنگا کی طرف سندھیا کرنے چلے گئے اور سُباما کھانا پکانے بیٹھی۔ آج کتنے دنوں کے بعد وہ من لگا کر کھانا پکا رہی ہے۔

دونوں باتیں کرنے لگیں:۔

سُباما۔ میری یہ دلی لالسا تھی کہ میرا لڑکا دنیا میں نیکنام ہو اور ایشور نے میری لالسا پوری کر دی۔ پرتاپ نے باپ کا اور خاندان کا نام روشن کر دیا۔ آج جب سویرے میرے پتی کی جے منائی جا رہی تھی تو میرا دل امڈ امڈ آتا تھا میں صرف اتنا چاہتی تھی کہ وہ یہ ویراگ تیاگ دیں۔ دیش کا اُپکار کرنے سے میں انہیں نہیں روکتی۔ میں نے تو دیوی جی سے یہی بردان مانگا تھا مگر انہیں سنیاس میں دیکھکر میرا کلیجہ بیٹھا جاتا ہے۔

برجن ۔ سُبامااکا مطلب سمجھ گئی ۔ بولی ۔ بیٹی یہ بات تو میرے دلمیں پہلے ہی سے جمی ہوئی تھی ۔ موقع پاتے ہی ضرور ذکر کرونگی

سُبلما ۔ موقع شاید ہی ملے ۔ اِنکا کون ٹھکانا ۔ اسیوقت جی میں آوے کہیں چلدیں سُنتی ہوں سونٹا ہاتھ میں لئے اکیلے جنگلوں میں گھومتے پھرتے ہیں ۔ مجھ سے اب بیچاری مادھوی کی دِشا نہیں دیکھی جاتی ۔ اسے دیکھتی ہوں تو جیسے کوئی میرے کلیجے کو چھلنے لگتا ہے ۔ میں نے بہت عورتیں دیکھیں اور بہتوں کا حال کتابوں میں پڑھا مگر ایسا پریم کہیں نہیں دیکھا ۔ بیچاری نے آدھی عمر رو رو کر کاٹ دی اور کبھی منہ سے شکایت کا ایک لفظ نہیں نکالا ۔ میں نے کبھی اُسے روتے نہیں دیکھا مگر رونے والی آنکھیں اور ہنسنے والے منہ چھپے نہیں رہتے ۔ مجھے ایسی ہی بہو کی لالسا تھی ۔ وہ بھی ایشور نے پوری کردی ۔ تم سے سچ کہتی ہوں میں اُسے اپنی بہو ہی سمجھتی ہوں آج سے نہیں برسوں سے ۔

برج رانی ۔ آج اُسے دن بھر روتے گزرا ۔ بہت اُداس دکھائی دیتی ہے ۔

سُباما ۔ تو آج ہی اُس کا ذکر چھیڑو ۔ ایسا نہ ہو کل کسی طرف کی راہ لیں تو پھر ایک جگ تک انتظار کرنا پڑے ۔

برج رانی (عذر کرکے) ذکر کرنے کو تو میں کردوں مگر مادھوی خود جیسی خوبی سے یہ کام کر سکتی ہے ۔ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا ۔

سُباما ۔ وہ بیچاری اپنی زبان سے کیا کہیگی ؟

برج رانی ۔ اُسکی آنکھیں آپ ساری رام کہانی کہہ دینگی ۔

سُبلما ۔ وہ اپنے دل میں کیا کہینگے ۔

برج رانی۔ کہنے لگے کیا؟ یہ تمہاری بھول ہے کہ تم مادھوی کو کنواری سمجھ رہی ہو۔ مدت گزری کہ وہ پرتاپ چند کی دلہن بن چکی ہے ایشور کے یہاں اُسکا بیاہ اُن سے ہو چکا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا دُنیا آدمیوں سے خالی تھی۔ مادھوی جیسی عورت کو کون آنکھوں میں نہ بٹھائیگا۔ کیا اُس نے اپنی آدھی جوانی مفت میں رو رو کر گنوائی ہے۔ اُس نے آجتک خیال میں بھی کسی غیر شخص کو جگہ نہیں دی بارہ برس سے تپسوِنی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ وہ پلنگ پر نہیں سوئی۔ کوئی رنگین کپڑا انہیں پہنا۔ بال تک نہیں گوندھائے۔ کیا یہ سب باتیں نہیں کہتیں کہ مادھوی کا بیاہ اُن سے ہو چکا۔ دلوں کا ملاپ سچا بیاہ ہے۔ سیندور کا ٹیکہ اور گٹھ بندھن اور بھانوریں یہ سب دُنیا کے ڈھکوسلے ہیں۔

سُباما۔ اچھا جیسا مناسب سمجھو کرو۔ میں صرف جگ ہنسائی سے ڈرتی ہوں۔

رات کے نو بج گئے تھے۔ آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے تھے۔ مادھوی باغیچہ میں اکیلی بیٹھی ہوئی تاروں کو دیکھتی تھی۔ اور دل میں سوچتی تھی کہ یہ دیکھنے میں کیسے چمکیلے ہیں مگر کتنی دُور۔ کوئی وہاں تک پہنچ سکتا ہے؟ کیا میری امیدیں بھی انہیں تاروں کی طرح ہیں۔ اتنے میں برجن نے اسکا ہاتھ پکڑ کر ہلایا۔ مادھوی چونک پڑی۔

برجن۔ اندھیرے میں بیٹھی یہاں کیا کر رہی ہے؟

مادھوی۔ کچھ نہیں۔ تاروں کو دیکھ رہی ہوں وہ کیسے خوشنما ہیں۔ مگر مل نہیں سکتے۔ برجن کے کلیجہ میں برچھی سی لگ گئی۔ ضبط کر کے بولی۔ "تارے گننے کا یہ وقت نہیں ہے جس مہمان کے لئے آج سویرے سے تُو پھولی نہیں سماتی تھی۔ کیا اسی طرح اسکی مہمانداری کرو گی؟

مادھوی :میں ایسے مہمان کی مہمانداری کرنے کے قابل کب ہوں؟
برجن :اچھا یہاں سے اُٹھو تو۔ میں مہمانداری کرنے کا ڈھنگ بتا دُوں گی۔
یہ کہہ کر برجن نے مادھوی کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھا دیا۔ دونوں اندر آئیں۔ سُباما کھانا پکا چکی تھی۔ بالاجی کو ماں کا بنایا ہوا کھانا آج مدتوں کے بعد ملا۔ بڑی رغبت سے کھایا۔ سُباما کھلاتی جاتی تھی اور روتی جاتی تھی۔ جب بالاجی کھا پی کر لیٹے تو برجن نے مادھوی سے کہا۔ "اب یہاں کونے میں منہ ڈھانپ کر کیا بیٹھی ہو؟"
مادھوی :کچھ دیر و کھا کے سوئی ہوں۔ اب یہی جی چاہتا ہے۔
برجن :مادھوی ایسی نراس نہ ہو۔ کیا اتنے دنوں کا برت ایک دن میں بھنگ کر دیگی۔

* * *   * *   * * *

مادھوی اُٹھی مگر دل بیٹھا جاتا تھا۔ جیسے بادلوں کی کالی کالی گھٹائیں اُٹھتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب جل تھل ایک ہو جائیگا۔ مگر یکایک پچھوا ہوا چلنے لگتی ہے اور سارے بادل کائی کی طرح پھٹ جاتے ہیں۔ اسی طرح اس وقت مادھوی کے دل کی کیفیت ہو رہی تھی۔
یہ مبارک دن دیکھنے کی آرزو اسکے دل میں کتنے دنوں سے تھی۔ کبھی وہ دن آئیگا کہ میں اُنکے درشن پاؤنگی۔ اور اُنکی امرت کی سی باتیں سنونگی۔ اس دن کے لئے اُس نے کیسی کیسی منتیں مانی تھیں۔ اس دن کے خیال ہی سے اُسکا دل کیسا کھل اُٹھتا تھا۔
آج صبح مادھوی بہت خوش تھی۔ اُس نے بڑے شوق سے پھولوں کا ہار گوندھا تھا۔ سینکڑوں کانٹے ہاتھ میں چبھا لئے۔ متوالوں کی طرح گر گر پڑتی تھی یہ سب خوشی اور نشہ اسی لئے تو تھا۔ کہ آج وہ مبارک دن آگیا۔ آج وُہ دن آگیا جسکی طرف ایک

مدت ہوئی زمانہ سے آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ وہ زمانہ بھی اب یاد نہیں جب یہ آرزو دل میں نہ رہی ہو۔ مگر اسوقت مادھوی کے دل کی وہ کیفیت نہیں۔ خوشی کی بھی انتہا ہوتی ہے۔ غالباً وہ مادھوی کی خوشی کی انتہا تھی۔ جب وہ باغیچہ میں جھوم جھوم کر پھولوں سے آنچل بھر رہی تھی۔ جس نے کبھی خوشی کا مزہ ہی نہ چکھا ہو۔ اسکے لئے اتنی ہی خوشی معراج کامرانی ہے۔ وہ غریب اس سے زیادہ خوشی کا بوجھ نہیں سنبھال سکتی۔ جن ہونٹوں پر کبھی ہنسی ہی نہیں آئی۔ انکا مسکرانا ہی ہنسی ہے۔ تم ایسوں سے زیادہ ہنسنے کی اُمید کیوں رکھتے ہو۔ مادھوی بالاجی کی طرف چلی مگر اس طرح نہیں جیسے ایک نئی نویلی بہو۔ ارمانوں سے بھری ہوئی سنگار کئے اپنے پتی کے پاس جاتی ہے۔ یہی کمرہ تھا جسے وہ اپنے دیوتا کا مندر سمجھتی تھی۔ جب مندر خالی تھا۔ تب وہ آ آکر اس میں آنسوؤں کے پھول چڑھاتی تھی۔ آج جب دیوتا نے پاس کیا ہے تو وہ کیوں یوں مچل مچل کر آرہی ہے۔

رات خوب بھیگ چکی تھی۔ سڑک پر سے گاڑیوں کی گھنٹیوں کی آوازیں کان میں آرہی تھیں۔ مادھوی دبے پاؤں بالاجی کے کمرہ کے دروازہ تک گئی۔ اُس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اندر جانیکی ہمت نہ پڑی۔ کسی نے پیر تھام لئے۔ اُلٹے قدم لوٹ آئی۔ اور زمین پر بیٹھکر رونے لگی۔ اُسکے دل نے کہا مادھوی! یہ بڑے شرم کی بات ہے۔ تو بالاجی کی چیری سہی۔ مانا کہ تجھے اُن سے پریم ہے مگر تو انکی دُلہن نہیں ہے۔ تجھے اسوقت اُنکے کمرہ میں قدم رکھنا ہرگز مناسب نہیں۔ تیرا پریم تجھے انکی پتنی نہیں بنا سکتا۔ پریم اور چیز ہے۔ سہاگ اور چیز ہے۔ پریم دل کا جھکاؤ ہے۔ بیاہ ایک پاک فرض ہے۔ تب مادھوی کو ایک بیاہ یاد آیا۔ دولھے نے بھری سبھا میں دلہن

کی بانہہ پکڑی تھی اور کہا تھا کہ اس استری کو میں اپنے گھر کی مالکہ اور اپنے دل کی دیوی
سمجھتا رہونگا۔ اس سبھا کے لوگ اور آکاش اور اگنی اور دیوتا اس کے گواہ رہیں۔ آہا!
کیسے مبارک الفاظ ہیں۔ مجھے بھی کبھی یہ الفاظ سُننے نصیب ہوئے تھے۔ میں نہ اگنی کو
اپنا ساکشی بنا سکتی ہوں نہ دیوتاؤں کو نہ آکاش کو۔ مگر اے اگنی۔ اے آکاش کے تارو
اے دیولوک کے باسیو! تم شاہد رہنا کہ مادھوی نے بالاجی کی پاک صورت کو دل میں جگہ
دی مگر کسی ناپاک خیال کو دل میں نہ آنے دیا۔ اگر میں نے کمرہ کے اندر قدم رکھا ہو تو اے
اگنی تم اسیوقت مجھے جلا کر راکھ کردو۔ اے آکاش! اگر تو نے اپنی ہزار آنکھوں
سے بھی مجھے کمرہ میں جاتے دیکھا ہو تو اسی دم مجھ پہ اندر کا بجر گرا دے۔

مادھوی کچھ دیر تک انہیں خیالات میں ڈوبی بیٹھی رہی۔ یکایک اُسکے کان میں
بھک بھک! کی آواز آئی۔ اس نے چونک کر دیکھا تو بالاجی کا کمرہ بہت زیادہ روشن
ہو گیا تھا۔ اور کھڑکیوں سے روشنی باہر نکلکر صحن میں پھیل رہی تھی۔ مادھوی کے پیر تلے
سے مٹی نکل گئی۔ معاً خیال گذرا کہ میز کا لیمپ بھبک اُٹھا۔ ہوا کی طرح وہ بالاجی
کے کمرہ میں گھسی۔ دیکھا تو لیمپ زمین پر پھٹ کر گر پڑا ہے۔ اور فرش میں تیل کے
پھیل جانے سے آگ لگ گئی ہے۔ دوسرے کنارے پر بالاجی آرام سے سو رہے
تھے۔ ابھی تک اُنکی نیند نہ کھلی تھی۔ اُنہوں نے قالین سمیٹ کر ایک کونے میں رکھدیا
تھا۔ بجلی کی طرح لپک کر مادھوی نے یہ قالین اُٹھا لیا اور اُسے شعلوں کے اوپر
گرا دیا۔ دھماکے کی آواز ہوئی۔ تو بالاجی نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ کمرہ میں دھواں
بھرا ہوا تھا۔ اور چاروں طرف تیل کی بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ واقعہ کی صورت سمجھ گئے بولے
"بڑی خیریت ہوئی۔ ورنہ کمرہ میں آگ لگ گئی تھی"۔

مادھوی۔ جی ہاں فلالیمپ گر پڑا تھا۔
بالاجی۔ تم بڑے موقع سے آپہنچیں۔ کیسے معلوم ہوا تمہیں؟
مادھوی۔ میں یہیں باہر بیٹھی ہوئی تھی۔
بالاجی۔ تم کو بڑی تکلیف ہوئی۔ اب جاکر سوؤ۔ رات زیادہ ہوگئی ہے۔
مادھوی۔ چلی جاؤنگی۔ سونا تو روز ہے۔ یہ موقع نہ جانے پھر کب آئے۔

مادھوی کی آواز میں غضب کا درد تھا۔ بالاجی نے اسکی طرف غور سے دیکھا اٹھارہ سال پہلے انہوں نے مادھوی کو دیکھا تھا۔ اسوقت وہ ایک کھلتی ہوئی کلی تھی۔ اور آج ایک مرجھایا ہوا پھول۔ نہ چہرہ پر تازگی نہ آنکھوں میں خوشی۔ نہ مانگ میں سہاگ کا جوڑا تھا۔ نہ ماتھے پر سیندور کا ٹیکہ جسم پر زیوروں کا نشان بھی نہ تھا بالاجی نے قیافہ سے سمجھا کہ بدھاتا نے عین شباب میں اس دکھیا کا سہاگ ہر لیا ہے۔ بہت مغموم ہوکر بولے:- "کیوں مادھوی۔ تمہارا بیاہ تو ہوگیا ہے؟"

مادھوی کے کلیجہ میں چھری اتر گئی۔ آبدیدہ ہوکر بولی۔ "جی ہاں ہوگیا ہے"

بالاجی۔ اور تمہارا پتی؟
مادھوی۔ انہیں میری کچھ سدھ ہی نہیں۔ انکا بیاہ مجھ سے نہیں ہوا؟

بالاجی متحیر ہوکر بولے۔ "تمہارا پتی کیا کرتا ہے؟"

مادھوی۔ دیش کی سیوا۔

بالاجی کی آنکھوں کے سامنے سے ایک پردہ سا ہٹ گیا۔ مادھوی کا مطلب سمجھ گئے۔ پوچھا:-

مادھوی! اس بیاہ کو کتنے دن ہوئے؟

مادھوی۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔ بہت دن ہوئے۔ شائد اٹھارہ بیس سال۔

بالاجی کی آنکھیں پُرآب ہوگئیں اور چہرہ پر قومی غرور کا نشہ سا چھاگیا۔

بھارت ماتا! آج اس گئے گزرے زمانہ میں بھی تمہاری گود میں ایسی دیویاں کھیل رہی ہیں جو ایک خیال پر اپنی زندگی اور جوانی کی آنند بھی قربان کر سکتی ہیں۔

بولے:۔ ایسے پتی کو تم تیاگ کیوں نہیں دیتیں؟

مادھوی نے بالاجی کی طرف پُرغرور نگاہوں سے دیکھا۔ اور بولی:۔ "سوامی جی! آپ اپنی زبان سے ایسا نہ فرمائیں۔ میں ہندو عورت ہوں۔ میں نے گاندھاری اور ساوتری کے کل میں جنم لیا ہے۔ جسے ایک بار دل سے اپنا پتی مان چکی اسے نہیں تیاگ سکتی۔ اگر میری زندگی یوں ہی روتے روتے کٹ جائے تو بھی اپنے پتی کی طرف سے مجھے مطلق ملال نہ ہوگا۔ جب تک میرے تن میں جان رہیگی۔ میں ایشور سے انکی بھلائی چاہتی رہونگی۔ میرے لئے یہی کیا کم ہے کہ ایسے مہاتما کے پریم نے میرے دلمیں باس کیا۔ میں اسی کو اپنا سوبھاگیہ سمجھتی ہوں۔ آج اٹھارہ سال سے زیادہ ہوا کہ میں نے بناؤ سنگار کا خیال تک دلمیں نہیں آنے دیا۔ میں نے ایکبار اپنے سوامی کو دُور سے دیکھا تھا اور وہ تصویر ایک دم کے لئے بھی میری نگاہوں سے نہیں اُتری۔ جب کبھی میں بیمار ہوئی ہوں۔ اسی تصویر نے میری تیمارداری کی ہے۔ جب کبھی میں نے بیوگ کے دُکھ سے بیچین ہوکر آنسو بہائے ہیں۔ اسی تصویر نے مجھے ڈھارس دیا ہے۔ اس پتی کو میں کیسے تیاگ دُوں۔ میں اسکی ہوں اور ہمیشہ اسی کی رہونگی۔ میرا دل اور میری جان اُسکے نذر ہو چکے اگر وہ کہے تو آج میں آگ کی گود میں ایسی خوشی سے جا بیٹھوں۔ گویا پھولوں کا سیج ہے۔ اگر میری جان اُسکے کسی کام آئے تو میں ایسی خوشی سے دے

دونگی ۔ جیسے کوئی اُپاسک دیوتا پر پھول چڑھا دیتا ہے ۔

مادھوی کا چہرہ جوش سے گلگوں ہو رہا تھا ۔ بالاجی نے اُسکی سُنیں اور دم بخود ہو گئے ۔ یہ وہ عورت ہے جس نے صرف میرے خیال پر اپنی زندگی قربان کر دی ۔ اس خیال سے بالاجی کی آنکھیں پُرآب ہو گئیں ۔ جس پریم نے ایک عورت کی زندگی جلاکر خاک کر دی ہو ۔ اُس کے لئے ایک آدمی کے استقلال کو جلا ڈالنا کوئی بڑی بات نہیں ۔ پریم کے مقابلہ میں ضبط کوئی چیز نہیں ہے ۔ بولے : " مادھوی ! تم جیسی دیویاں بھارت کے لئے سرمایۂ ناز ہیں ۔ میں بڑا خوش نصیب ہوں کہ تمہارے پریم جیسی انمول چیز یوں میرے ہاتھ آ رہی ہے ۔ اگر تم نے میرے لئے جوگنی بننا پسند کیا ہے تو میں بھی تمہارے لئے اس سنیاس اور ویراگ کو خیرباد کہہ سکتا ہوں جس کے لئے تم نے اپنے تئیں مٹا دیا ہے ۔ وہ تمہارے لئے بڑی سے بڑی قربانی کرنے سے بھی نہ ہچکیگا ۔ "

مادھوی نے فوراً جواب دیا ۔ وہ اس جواب کے لئے پہلے ہی سے تیار تھی ۔ " سوامی جی ! میں بہت کمزور اور بےعقل عورت ہوں مگر میں آپکو یقین دلاتی ہوں کہ ذاتی آرام کا خیال آجتک ایک لمحہ کے لئے بھی میرے دل میں نہیں آیا ۔ اگر آپنے یہ خیال کیا کہ میرے پریم کا معراج صرف یہ ہے کہ آپ کے پیروں میں سنسار کے بندھنوں کی بیڑیاں ڈالدوں تو (ہاتھ جوڑکر) آپنے اسکی حقیقت بالکل غلط سمجھی ۔ میرے پریم کا معراج وہی تھا جو آج مجھے حاصل ہو گیا ۔ آج کا دن میری زندگی کا سب سے مبارک دن ہے ۔ آج میں اپنے پران ناتھ کے سامنے کھڑی ہوں اور اپنے کانوں سے اُنکی امرت مئی باتیں سن رہی ہوں ۔ سوامی جی ! مجھے اُمید نہ تھی کہ اس زندگی میں مجھے یہ

دن دیکھنا نصیب ہوگا - اگر میرے پاس دنیا کا راج ہوتا تو میں اس خوشی میں اسے آپ کے قدموں پر نثار کر دیتی - میں ہاتھ جوڑ کر آپ سے منت کرتی ہوں کہ مجھے اب چرنوں سے الگ نہ کیجئے گا - میں سنیاس لے لونگی اور آپ کے ساتھ رہونگی - میں ویراگن بنونگی - بھبوت رماؤنگی - مگر آپ کا ساتھ نہ چھوڑونگی - پران ناتھ میں نے بہت دکھ سہے ہیں - مگر اب یہ جلن نہیں سہی جاتی -"

یہ کہتے کہتے مادھوی کا گلا رندھ گیا اور آنکھوں سے پریم کی دھارا بہنے لگی - اس سے وہاں نہ بیٹھا گیا - اٹھکر پرنام کیا اور برجن کے پاس آ کر بیٹھ گئی - برج رانی نے اسے گلے لگا لیا اور پوچھا - کیا بات چیت ہوئی ؟

مادھوی - جو تم چاہتی تھیں -

برج رانی - سچ - کیا بولے ؟

مادھوی - یہ نہ بتلاؤنگی -

برج رانی کو گویا بڑی دولت مل گئی - بولی - ایشور نے بہت دنوں میں میرا حوصلہ پورا کیا - میں اپنے یہاں سے بیاہ کرونگی - مادھوی مایوسانہ انداز سے مسکرائی برجن نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا - "ہمکو بھول تو نہ جائیگی" اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے - پھر آواز سنبھالکر بولی - "تو ہم سے اب بچھڑ جائیگی" -

مادھوی - "میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہ جاؤنگی"

برجن - "چل باتیں نہ بنا"

مادھوی - "دیکھ لینا"

برجن - "دیکھا ہے - جوڑا کیسا پہنیگی"

مادھوی ۔ سفید جیسے بگلے کا پر۔
برجن ۔ سہاگ کا جوڑا کیسریئے رنگ کا ہوتا ہے۔
مادھوی ۔ میرا اجلا رہیگا۔
برجن ۔ تجھے چندر ہار بہت پسند تھا میں اپنا دیدونگی ۔
مادھوی ۔ (مسکرا کر) ہار کی جگہ کنٹھی دیدینا۔
برجن ۔ کیسی باتیں کر رہی ہے؟
مادھوی ۔ اپنے سنگار کی ۔
برجن ۔ تیری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں ۔ تو اسوقت اتنی اداس کیوں ہے ۔ تُو نے اس رتن کے لئے کیسی کیسی تپسیا کی ۔ کیسا کیسا جوگ سادھا ۔ کیسے کیسے برت رکھے اور آج تجھے جب وہ رتن مل گیا تو تو خوش نہیں دکھائی دیتی ۔
مادھوی ۔ تم بیاہ کی بات چیت کرتی ہو ۔ اس سے مجھے صدمہ ہوتا ہے ۔
برجن ۔ یہی تو خوش ہونے کی بات ہے ۔
مادھوی ۔ بہن میرے بھاگ میں وہ خوشی لکھی ہی نہیں جو چڑیا بادلوں میں گھونسلا بنانا چاہتی ہے وہ سدا ڈالیوں پر رہیگی ۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ زندگی کے یہ چند سال اسی طرح پریم کا سپنا دیکھنے میں کاٹ دوں ۔

الوداع

دوسرے دن بالاجی اشنان دھیان سے فارغ ہوکر راجہ دھرم سنگھ کا انتظار کرنے لگے۔ آج راج گھاٹ پر ایک عظیم الشان گؤشالہ کی بنیاد پڑنے والی تھی۔ شہر کے کوچہ و بازار مسکراتے نظر آتے تھے۔ سڑک پر دو رویہ بیرقیں اور جھنڈیاں لہرا رہی تھیں سڑکیں سہاگن ہو کر اپنا سینہ فرش راہ کیے ہوئے تھیں۔ دروازے پھولوں کی مالا گلے میں ڈالے خیر مقدم کرنے کے لئے تیار تھے۔ کیونکہ آج اس حبیب وطن کی آمد ہے جس نے اپنا سب کچھ ملک پر قربان کر دیا ہے۔

خوشی کی دیوی اپنی سکھیوں سہیلیوں کے ساتھ محو خرام تھی۔ ہوا مستی سے جھومتی پھرتی تھی۔ رنج و غم کا کہیں نشان نہ تھا۔ جا بجا نوبت جھڑ رہی تھی۔ مرد خوش وضع لباس زیب تن کئے اٹھلاتے تھے۔ عورتیں سولہوں سنگار کئے منگل گیت گاتی تھیں۔ لڑکے زعفرانی صافے باندھے کلیلیں کرتے تھے ہر مرد و زن کے چہرے سے خوشی جھلک رہی تھی۔ کیونکہ آج قوم کے ایک سچے جاں نثار کی آمد ہے۔ جس نے اپنا سب کچھ قوم کی نذر کر دیا ہے۔

بالاجی جب اپنے جاں نثار رفیقوں کے ساتھ راجگھاٹ کی طرف چلے تو سورج نے گوشۂ مشرق سے نکل کر انکا استقبال کیا۔ انکا مردانہ چہرہ جونہی لوگوں نے دیکھا ہزاروں زبانوں سے "بھارت کی جے" کا پرخروش نعرہ نکلا اور فضائے آسمان

کو چیرتا ہوا گنبد گردوں تک جا پہنچا۔ گھنٹے اور ناقوس کی صدائیں بلند ہوئیں اور مسرت کے دلآویز نغمے ہوا میں گونجنے لگے۔ جس طرح شمع کو دیکھتے ہی پروانے اس پر نثار ہونے کو ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اسی طرح بالاجی کو دیکھکر لوگ بڑی تیزی سے انکے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ ارجن سبھا کے سوا سو ممبروں نے باقاعدہ سلام کیا۔ انکی خوشنما وردیاں اور سبک خرام گھوڑے نظروں میں کھبے جاتے تھے۔ اس جماعت کا ایک ایک ممبر قوم کا سچا جاں نثار تھا اور انکے پرجوش نعرے لوگوں کے دلوں کو حوصلہ سے لبریز کئے دیتے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ نوبتیں جھڑ رہی تھیں۔ پھول اور میوے برس رہے تھے۔ جابجا شہر کی للنائیں سنگار کئے سنہرے تھالوں میں کافور، پھول اور صندل لئے آرتی اتارنے جاتی تھیں۔ دوکانیں عروس زیبا کی طرح آراستہ تھیں۔ سارا شہر رشک چمن بنا ہوا تھا اور جس طرح ساون کے مہینہ میں کالی کالی گھٹائیں اٹھتی ہیں اور رہ رہ کر بادل کی دھن گرج صدا دلوں کو ہلا دیتی ہے اسی طرح اس خلقت بے پایاں کی زبانوں سے "بھارت کی جے" کی حوصلہ خیز آوازیں دلوں میں ولولہ اور گرمی پیدا کر رہی تھیں۔ جب بالاجی چوک میں پہنچے تو ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ پانچسو نوعمر لڑکے اودے رنگ کے لیس دار کوٹ پہنے زعفرانی رنگ کے پیچدار صافے باندھے اور ہاتھوں میں خوبصورت ڈنڈے لئے سر راہ کھڑے تھے۔ بالاجی کو دیکھتے ہی وہ دس دس کی قطاروں میں ہو گئے اور اپنے ڈنڈے بجا بجا کر یہ پُر اثر گیت گانے لگے۔

بالاجی تیرا آنا مبارک ہووے

دھن دھن بھاگ ہیں اس نگری کے   دھن دھن بھاگ ہمارے

دھن دھن اس نگری کے باسی   جہاں تیرے چرن پدھارے
بالاجی تیرا آنا مبارک ہوئے

کیسا نظارہ دلکشا تھا۔ نغمہ اگرچہ سادہ تھا مگر متعدد اور موزوں آوازوں نے ملکر اُسے بلا کا دلکش اور پُر اثر بنا دیا تھا۔ لوگوں کے قدم وہیں جم گئے اور چوطرفہ سناٹا چھا گیا۔ خموشی میں یہ ترانہ ایسا ہی سہانا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے رات کے سناٹے میں نغمۂ عندلیب۔ سارا عالم نقش حیرت بنا کھڑا تھا۔ غریب بھارت باسیو! تم نے ایسے نظارے کہاں دیکھے۔ اسوقت خوب سیر ہو کر دیکھ لو۔ تم رقاصان دلنواز کی نغمہ سرائیں سے آسودہ ہو گئے حسینوں کی نازک ادائیاں بہت دیکھ چکے۔ گل و گلشن کی بہت سیریں کیں مگر وہ مسرت علوی۔ وہ حوصلہ طرب خیز جو اسوقت تم محسوس کر رہے ہو۔ تمہیں کبھی اور بھی حاصل ہوا تھا۔ رقاصان دلنواز کے نغمے اور حسینوں کی نازک ادائیاں اور گل و گلشن کی سیریں تمہارے نفس کو خوش کرتی ہیں مگر تمہارے حوصلوں کو پست اور کمزور بنا دیتی ہیں۔ لیکن ایسے نظارے تم میں قومیت اور قومی جوش اور قومی ہمدردی کا احساس پیدا کرتے ہیں۔ اگر تم نے اپنی زندگی میں ایکبار بھی یہ نظارہ دیکھا ہے تو اس کا پاک نقش تمہارے دلوں سے کبھی نہ مٹیگا۔

بالاجی کا وجیہہ چہرہ روحانی مسرت کی روشنی سے منور ہو رہا تھا اور آنکھوں سے سچے قومی غرور کی شعاعیں نکل رہی تھیں جسطرح کسان اپنے لہلہاتے ہوئے کھیت کو دیکھ کر خوشی کے نشہ سے متوالا ہو جاتا ہے وہی کیفیت اسوقت بالاجی کی تھی جب نغمہ بند ہو گیا۔ تو انھوں نے چند قدم آگے بڑھکر دو چھوٹے چھوٹے بچوں کو اُٹھا کر اپنے کندھوں پر بٹھا لیا اور عالم مستی میں زور سے ایک نعرہ لگایا۔ "بھارت ماتا کی جے"!

اس طرح خراماں خراماں لوگ راجگھاٹ پہنچے۔ یہاں گئوشالہ کی ایک شاندار سر بفلک عمارت استقبال کے لئے کھڑی تھی۔ صحن میں مخملی فرش بچھا ہوا تھا۔ محرابیں ستون اور دروازے خوشنما پھولوں اور پتیوں سے سجے ہوئے تھے۔ مکان کے اندر کئی ہزار گائیں بندھی ہوئی تھیں۔ بالاجی نے اپنے ہاتھوں سے انکے ناندوں میں کھلی اور بھوسہ ڈالا۔ انہیں پیار سے تھپکیاں دیں۔ ایک وسیع کمرہ میں سنگ مرمر کا منقش حوض بنا ہوا تھا۔ دودھ سے لبریز۔ بالاجی نے ایک چلو دودھ لیکر آنکھوں سے لگایا اور پی گئے۔ اسکے بعد ہزاروں آدمی اس چشمۂ آب حیات سے فیضیاب ہوئے۔

ابھی صحن میں لوگ اطمینان سے بیٹھنے بھی نہ پاتے تھے کہ کئی آدمی بدحواس دوڑتے ہوئے آئے اور کہا کہ پنڈت دیو شاستری سیٹھ اُتم چند اور لالہ مکھن لال باہر کھڑے غل مچا رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمکو بالاجی سے دو دو باتیں کر لینے دو۔ دیو شاستری بنارس کے نامی گرامی پنڈت تھے۔ خوبصورت ہلالی تلک لگاتے سیر بانات کی مرزائی پہنتے اور بسنتی پگڑی باندھتے تھے۔ اُتم چند اور مکھن لال دونوں شہر کے رئیس اعظم لکھپتی آدمی تھے۔ خطاب کے لئے ہزاروں لاکھوں خرچ کرتے اور اعلیٰ عہدہ داروں کی تواضع و تکریم و خاطر و مدارت کو فرض اولیٰ سمجھتے تھے۔ ان حضرات کا شہر کے آدمیوں پر بڑا دباؤ تھا۔ دیو شاستری جب کبھی شاستراتھ کرتے تو یہ یقینی بات تھی کہ فریق ثانی کی خیریت نہیں خصوصاً بنارس کے پنڈے اور پراگوال اور اسی قبیل کے دوسرے مفت خور تو انکے پسینہ کی جگہ خون بہانے کو تیار رہتے تھے۔ شاستری جی بنارس میں سناتن دھرم کے وکیل اور رکن اعظم مشہور تھے۔ اُتم چند اور مکھن لال بھی مذہبی جوش و خروش سے لبریز تھے۔ اسوقت انکی تشریف آوری فتنہ

انگریزی سے خالی نہ تھی سناتن دھرم کا فرض ا لین تمدن کے نقائص کی حمایت کرنا ہے اور چونکہ بالاجی اصلاح کے پُر زور حامی تھے۔ اسلئے انکی مخالفت کرنا اور انہیں ک دیاسناتن دھرم کے اراکین کا فرض مذہبی تھا۔ بالاجی کی روز افزوں کامیابیوں کو دیکھ دیکھکر اُنکے کلیجے پر سانپ لوٹا رہتا تھا۔ اور یہ لوگ عرصے سے بالاجی کے ساتھ شاستراتھ کرنے یا بہ الفاظ دیگر فوجداری کرنے کا موقع ڈھونڈھ رہے تھے۔ آج اُن کی دلی مرادیں بر آئیں۔ پنڈتوں اور پراگوالوں کی ایک جمعیت کثیر لیکر آ پہنچے۔

بالاجی نے ان مہاتماؤں کے آنیکی خبر سنی تو باہر نکل آئے۔ مگر یہاں کی کیفیت دیکھی تو ہوش اُڑ گئے۔ طرفین کے لوگ لاٹھیاں سنبھالے۔ آستین چڑھائے گھتنے کو تیار کھڑے تھے۔ شاستری جی پراگوالوں کو وار کرنے کیلئے للکار رہے تھے اور سیٹھ جی باواز بلند فرما رہے تھے۔ کہ ان شودروں کی دھجیاں اُڑا دو۔ ہم عدالت میں دیکھ لیں گے۔ تمہارا بال بیکا نہ ہونے پائیگا۔ بھمن لال بھی گلا پھاڑ پھاڑ کر فرماتے تھے کہ نکل آئے جسے بونا ہو۔ ایک ایک کو بستر مارغ دکھا دونگا۔ بالاجی نے جب یہ رنگ دیکھا تو راجہ دھرم سنگھ سے بولے۔ آپ بدلو شاستری کو جا کر سمجھ۔ دیجئے کہ اس شور وشغب سے باز آئیں ورنہ طرفین کا نقصان ہوگا اور جگ ہنسائی ہوگی۔ الگ راجہ صاحب کی آنکھوں سے انگارے برس رہے تھے بولے اس شخص سے بات کرنا میں اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ اسے پراگوالوں کی جمعیت پر غرہ ہے۔ مگر میں آج اُنکی ساری شیخی کرکری کئے دیتا ہوں۔ اُن کا منشا بجز اسکے اور کچھ نہیں کہ آپ پر وار کریں مگر جب تک میں اور میرے پانچوں بیٹے زندہ ہیں کوئی آپکی طرف آنکھ نہیں اُٹھا سکتا۔ بس آپکے ایک اشارہ کی دیر ہے اور میں دم

کی دم میں انہیں اس شرارت کا مزہ چکھا دونگا۔

بالاجی سمجھ گئے کہ یہ شیر بپھر گیا ہے۔ اس سے مصالحت کی امید رکھنی فضول ہے راجپوت جب بپھر تا ہے تو اسے مرنے مارنے کے سوائے اور کوئی خیال نہیں رہتا۔ بولے "مہاراجہ صاحب! آپ دور اندیش ہو کر ایسی باتیں کرتے ہیں۔ یہ موقع ایسی باتوں کا نہیں ہے۔ آگے بڑھکر اپنے آدمیوں کو روک دیجئے ورنہ نتیجہ بہت برا ہو جائیگا۔"

بالاجی یہ کہتے کہتے یکایک رک گئے۔ سمندر کی لہروں کی طرح لوگ اِدھر اُدھر سے اُمڈتے چلے آتے تھے۔ ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں اور آنکھوں میں خون کی سرخی۔ چہرے غضبناک۔ تیوریوں پر بل پڑے ہوئے۔ دیکھتے دیکھتے یہ جماعت کثیر پراگیوالوں کے سر پر پہنچ گئی۔ اور قریب تھا کہ لاٹھیاں سروں کا بوسہ لیں اور سنگینیں کلیجوں میں چبھیں کہ بالاجی بجلی کی طرح کوند کر ایک گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ اور نہایت پُر زور لہجہ میں فرمایا۔

"بھائیو! یہ کیا اندھیر ہے۔ اگر مجھے اپنا دوست سمجھتے ہو تو فوراً ہاتھ نیچے کر لو اور پیروں کو ایک انچ آگے مت بڑھنے دو۔ مجھے فخر ہے کہ تمہارے دلوں میں مردانہ غصہ اور جوش موجزن ہو رہا ہے۔ مردانہ غصہ ایک پاک جذبہ اور مقدس جوش ہے مگر مردانہ ضبط اس سے بھی زیادہ پاک اور مقدس ہے۔ اسوقت اپنے غصہ کو ضبط سے روکو۔ کیا تم اپنے قوم کے ساتھ کل فرائض ادا کر چکے کہ یوں جان دینے پر آمادہ ہو۔ کیا تم مشعل لیکر بھی کنوئیں میں گرنا چاہتے ہو۔ یہ لوگ تمہارے ہموطن۔ تمہارے بھائی تمہارے ہی خون ہیں۔ انہیں اپنا دشمن مت سمجھو اگر وہ جاہل ہیں تو انکی جہالت کو دور کرنا تمہارا فرض ہے۔ اگر وہ تمہیں گالیاں دیں تو تم برا مت مانو۔ اگر وہ تم سے

لڑنے پر آمادہ ہوں تو تم سلامت روی اختیار کرو اور ایک ہوشیار حکیم کی طرح اپنے بدمزاج مریضوں کے علاج کرنے میں مصروف رہو۔ میں نے تم کو بآوازِ بلند منع کر دیا ہے اگر میرے حکم کے خلاف تم میں سے کسی نے ہاتھ اُٹھایا تو وہ قوم کا دشمن ہوگا۔

ان پُرزور الفاظ نے ہر طرف سکوت کا عالم طاری کر دیا جو جہاں تھا وہیں نقش دیوار بن گیا۔ اس ایک شخص کی آواز میں کس قیامت کا اثر تھا جس نے پچاس ہزار آدمیوں کے اُمڈتے ہوئے جوش کو یوں فرو کر دیا۔ جیسے کوئی ہوشیار کوچبان شریر گھوڑے کو روک لیتا ہے اور یہ طاقت اُسے کس نے دی تھی؟ نہ اُسکے سر تاجِ شاہی تھا۔ نہ وہ کسی فوج کا سپہ سالار تھا مگر اُس پاک اور بےغرض قومی خدمت کا جلوہ تھا جو اُس نے انجام دی تھی۔ خادمِ قوم کے اعزاز و امتیاز کا پیمانہ وہ قربانیاں ہوتی ہیں جو وہ اپنے قوم کیلئے کرتا ہے۔

پنڈتوں اور پراگوالوں نے بالاجی کی پُرجلال صورت دیکھی اور پُرزور آواز سُنی تو اُنکا جوش بھی فرو ہوگیا جس طرح آفتاب کے نکلتے ہی کہرا پھٹ جاتا ہے۔ اُسی طرح بالاجی کے آنے سے مخالفین کی یہ فوج منتشر ہوگئی۔ کتنے ہی آدمی جو شر و فساد کی نیت سے آئے تھے وفورِ عقیدت سے بالاجی کے روبرو سر جھکایا۔ اور اُنکے عقیدتمندوں کے زمرہ میں شامل ہوگئے۔ بدلو شاستری نے ہر چند چاہا کہ پنڈتوں کے تعصب اور جہالت کو مشتعل کریں مگر ناکام رہے۔

اسوقت بالاجی نے ایک نہایت پُرزور تقریر کی جس کا ایک ایک لفظ آج تک سُننے والوں کے دلوں میں منقوش ہے اور جو اہلِ ہند کے لئے ہمیشہ مشعل کا کام دیگا۔ بالاجی کی یوں تو بہت سی تقریریں ہیں مگر وہ جوش وہ شعلہ اور وہ بلندی جس سے یہ تقریر مرصع ہے۔ اُنکی کسی تقریر میں نظر نہیں آتی۔ اُنہوں نے جادو کے کلام کے زور سے

چند لمحوں میں پنڈتوں کو امیدوں اور یاسیوں سے گلے ملا دیا ۔ اُس جادو صفت تقریر کے یہ آخری الفاظ تھے ۔

" اگر آپ مستقل مزاجی سے کام کرتے چلے جائیں گے ۔ تو ضرور ایک دن آپکو منزل مقصود کا سنہرا مینار دکھائی دیگا ۔ مگر استقلال کو کبھی ہاتھ سے نہ دینا ۔ استقلال بڑی زبردست قوت ہے استقلال مردانہ خوبیوں کا بادشاہ ہے ۔ استقلال اوصاف دلاوری کا جوہر ہے ۔ اسے ہرگز ہاتھ سے نہ دینا ۔ تمہارے سامنے آزمائشیں آئینگی ۔ تمہیں متواتر مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑیگا ۔ ناکامیاں تمہاری عنان گیر ہوں گی ایسی حالتوں میں سوائے استقلال کے تمہیں کوئی قابل اعتماد رہنما نہ ملے گا ۔ استقلال اگر کامیاب نہ بھی ہو سکے تو دُنیا میں اپنا نشان چھوڑ جاتا ہے "

جب بالاجی مکان کی طرف چلے تو آفتاب گوشۂ مغرب میں چھپ رہا تھا ۔ اُنہیں چوک کی رونق اور زندہ دلی دیکھکر بہت خوشی ہوئی ۔ آج شہر والوں نے اس حبیب وطن کی آمد کی مُبارکباد میں شہر کو چراغاں کرنے کی تیاریاں کی تھیں ۔ سڑک کے دونوں طرف محرابیں بنائی جا رہی تھیں ۔ چوراہوں پر رفیع الشان پھاٹک کھڑے تھے اور دوکانوں پر جھاڑ فانوس اور ہانڈیاں زیب دے رہی تھیں ۔ اس عام مسرت کے جوش میں لوگ اپنے ذاتی دُکھڑے بھُول گئے تھے مگر اتفاقات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ مسرت کے یہ سارے سامان درہم برہم ہو گئے ۔ بالاجی نے مکان پہ پہنچکر اخبار کھولا تو چہرہ زرد ہو گیا ۔ اور دل پر درد منہ سے ایک ٹھنڈی سانس نکل آئی ۔

راجہ صاحب نے گھبرا کر پوچھا : " خیریت تو ہے " ؟

بالاجی ۔ سدریا میں طوفان آ گیا ۔ اور دریا کا باندھ پھٹ پڑا ۔ دس ہزار آدمی خانہ تباہ ہو گئے ۔

دھرم سنگھ:۔ اُف!

بالاجی۔ ہزاروں آدمی سیلاب میں بہہ گئے۔ سارا شہر مسمار ہو گیا۔ مکانوں کی چھتوں پر کشتیاں چل رہی ہیں۔ ارجن سبھا کے لوگ پہنچ گئے ہیں اور حتی الوسع آدمیوں کو تباہ ہونے سے بچا رہے ہیں۔ مگر اُنکی تعداد بہت کم ہے۔

دھرم سنگھ:۔ چشم پُر آب ہو کر، یا ایشور۔ تو ہی ان غریبوں کا مالک ہے۔

بالاجی۔ گوپال گئو شالہ بہہ گیا۔ ایکہزار گائیں سیلاب کی نذر ہو گئیں۔ تین گھنٹہ تک لگاتار موسلا دھار مینہہ برستا رہا۔ ۱۶ انچ پانی گرا۔ شہر کے جنوبی حصہ میں ساری آبادی جمع ہے۔ نہ رہنے کو مکان ہیں نہ کھانے کو دانہ۔ لاشوں کا انبار لگا ہوا ہے۔ بہت سے لوگ بھوکوں مرے جاتے ہیں۔ اور لوگوں کے نالہ و شیون سے کلیجہ مُنہ کو آیا جاتا ہے۔ سب مصیبت زدہ آدمی بالاجی کو بلانے کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔ اُنکا خیال ہے کہ میرے پہنچنے سے اُنکی مصیبتیں رفع ہو جائینگی۔

تھوڑی دیر تک بالاجی آنکھیں بند کئے گہرے خیال میں ڈوبے بیٹھے رہے۔ بعد ازاں بولے "میرا جانا ضروری ہے۔ میں اسیوقت جاؤنگا۔ آپ سیوا کے ارجن سبھا کو تار دے دیجیے کہ وہ اس کام میں میرا ہاتھ بٹانے کو تیار رہیں"۔

راجہ صاحب نے منت آمیز لہجہ میں کہا۔ "ارشاد ہو تو میں بھی ساتھ چلوں"

بالاجی۔ میں وہاں پہنچکر آپکو اطلاع دوں گا۔ میرے خیال میں آپکے جانے کی ضرورت نہ ہوگی۔

دھرم سنگھ۔ بہتر ہوتا کہ آپ علی الصباح جاتے۔

بالاجی۔ جی نہیں۔ مجھے یہاں لمحہ بھر ٹھہرنا شاق گزر رہا ہے۔ ابھی مجھے وہاں تک

پہنچنے میں کئی دن لگیں گے۔

دم کی دم میں سارے شہر میں یہ خبر پھیل گئی کہ سدیا میں طوفان آگیا اور بالاجی وہاں اسیوقت جارہے ہیں۔ یہ سنتے ہی ہزاروں آدمی بالاجی کو رخصت کرنے کے لئے نکل پڑے اور نو بجتے بجتے دروازہ پر تقریباً پچیس ہزار آدمیوں کا مجمع ہوگیا۔ سدیا کی خبریں ہر کس و ناکس کی زبان پر تھیں۔ لوگ اُن مصیبت زدوں کی حالت پر ہمدردی و افسوس کررہے تھے۔ صدہا آدمی بالاجی کے ساتھ جانے پر آمادہ تھے اور سدیا والوں کی امداد کے لئے ایک فنڈ کھولنے کا چرچا ہورہا تھا۔

اُدھر رانی دھرم سنگھ کے محل میں شہر کی خاتونوں نے آج سُباما کو مبارکباد دینے کے لئے ایک جلسہ کیا تھا۔ عالیشان حویلی کا ایک ایک گوشہ عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ پہلے برج رانی نے کئی عورتوں کے ساتھ ایک مبارکباد کا سہانا گیت گایا اور اسکے بعد سب عورتیں حلقہ باندھکر گاتی بجاتیں آرتی کا تھال لئے سُباما کے مکان پر آئیں سیلوتی اور چند راجہمانوں کا مصافحہ کرنے کے لئے پہلے ہی سے موجود تھیں۔ سُباما ہر ایک خاتون سے گلے ملی اور انہیں دعا دی کہ تمہاری گود میں بھی ایسے ہی سپوت بچے کھیلیں۔ پھر رانی صاحبہ نے اُسکی آرتی اُتاری اور گانا ہونے لگا۔ آج مادھوی کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ کل کی طرح آج وہ مایوس و مغموم نہ تھی۔ آرزوئیں لہب کی گانٹھ ہیں انہیں آرزوؤں نے کل اُسے رلایا تھا۔ مگر آج اُسکا دل اُن آرزوؤں سے خالی ہو گیا ہے۔ اسی لئے چہرہ شگفتہ اور آنکھیں روشن ہیں۔ بے آرزو رہکر اس دیوی نے ساری زندگی کاٹ دی مگر باآرزو رہکر اس سے ایک دن کا دُکھ بھی نہ جھیلا گیا۔

سہانے راگوں کے الاپ سے مکان گونج رہا تھا کہ یکایک سدیا کی خبر یہاں بھی

پہنچی اور راجہ دھرم سنگھ یہ کہتے ہوئے سُنائی دئے "آپ لوگ بالاجی کو رخصت کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ وہ اسیوقت سدیا جا رہے ہیں"۔

یہ سنتے ہی آدھی رات کی سی خاموشی چھا گئی۔ سُبلا گھبرا کر اُٹھی اور دروازہ کی طرف لپکی۔ گویا وہ بالاجی کو روک لیگی۔ اُسکے ساتھ سب کی سب عورتیں اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ اور اُسکے پیچھے پیچھے چلیں۔ برج رانی نے کہا، بہن! کیا اُنہیں زبردستی رخصت کروگی ابھی تو اپنے کمرے ہی میں ہیں

سُبلا۔ میں اُنہیں نہ جانے دونگی۔ رخصت کرنا کیسا؟

برج رانی۔ اُن کا سدیا جانا ضروری ہے

سُبلا۔ میں کیا سدیا کو لیکر چاٹونگی بھاڑ میں جائے۔ آخر میں بھی تو کوئی چیز ہوں۔ میرا بھی تو اُن پر کوئی حق ہے۔

برج رانی۔ تمہیں میری قسم اسوقت اس قسم کی باتیں نہ کرنا ہزاروں آدمی محض اُن کے بھروسے پر جی رہے ہیں یہ نہ جائیں گے تو قہر ہو جائیگا۔

محبت مادرانہ انسانیت اور رحمیت کے احساس پر غالب آ گئی۔ مگر برج رانی نے سمجھا کر روک لیا۔ سُبلا اس واقعہ کو یاد کر کے ہمیشہ افسوس کرتی تھی۔ اُسے تعجب ہوتا تھا کہ میں آپے سے باہر کیوں ہو گئی تھی۔ رانی صاحبہ نے پوچھا "برجن! بالاجی کو جَے مال کون پہنائیگا"؟

برجن۔ آپ۔

رانی صاحبہ۔ اور تم کیا کروگی؟

برجن۔ میں اُن کے ماتھے پر تلک لگاؤنگی

رانی صاحبہ - مادھوی کہاں ہیں؟
برجن - (آہستہ سے) اُسے نہ چھیڑو - بیچاری اپنے خیال میں مگن ہے۔

اسی اثنا میں بالاجی باہر نکلے - انہیں دیکھتے ہی لوگوں نے پُرجوش نعرہ مارا۔ "بھارت کی جے"۔ عورتیں بھی اُن کی طرف بڑھیں۔ بالاجی نے سُباما کو دیکھا تو نزدیک آکر اُسکے قدم چوم لئے۔ سُباما نے انہیں اُٹھا کر چھاتی سے لگایا۔ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر وفورِ جذبات نے زبان نہ کھلنے دی۔ رانی صاحبہ پھولوں کا جیمال لیکر چلیں کہ اُنکے گلے میں ڈالدوں مگر پیر تھرائے اور آگے نہ بڑھ سکیں۔ برجرانی چندن کا تھال لیکر چلی مگر آنکھیں ندی کی طرح اُمڈ آئیں اور دل بیٹھ گیا۔ تب مادھوی چلی اُسکی آنکھوں میں پریم کی چمک تھی اور چہرہ پر پریم کی سُرخی۔ ہونٹوں پر دلآویز مُسکراہٹ جھلک رہی تھی اور دل پریم کے نشہ میں مگن تھا۔ اُس نے بالاجی کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جو اتھاہ محبت سے لبریز تھیں اور تب سر نیچا کر کے پھولوں کا جیمال گلے میں ڈالدیا ماتھے پر چندن کا ٹیکہ لگایا اور پریم کا بیڑا ہاتھ میں دیدیا۔ مراسمِ ظاہری کی کسر تھی وہ بھی پوری ہو گئی اُسوقت بالاجی نے گہری سانس لی اور انہیں معلوم ہوا کہ میں پریم کے اپار سمندر میں بہا جا رہا ہوں۔ ضبط کا لنگر اُکھڑ گیا اور اس شخص کی طرح جو یکایک پانی میں پھسل پڑا ہو انہوں نے بے اختیار مادھوی کی بانہہ پکڑ لی مگر آہ! جس تنکے کا اُنہوں نے سہارا لیا وہ خود پریم کی دھار میں تیزی سے بہا جا رہا تھا۔ اُنکا ہاتھ پڑتے ہی مادھوی کے رگ رگ میں بجلی سی کوند گئی۔ بدن میں پسینہ آ گیا اور جسطرح ہوا کے جھونکے سے پنکھڑیوں پر جمے ہوئے شبنم کے قطرے زمین پر گر پڑتے ہیں۔ اُسی طرح مادھوی کی آنکھوں سے آنسو کی بوندیں بالاجی کے ہاتھ پر ٹپک پڑیں۔ یہ پریم کے موتی تھے جو اِن متوالی آنکھوں نے بالاجی کے بھینٹ کئے ہیں۔ آج سے یہ آنکھیں پھر نہ روئینگی ؛

آسمان پر تارے چھٹکے ہوئے تھے۔ اور انکی آڑ میں بیٹھی ہوئی دیویاں یہ نظارہ دیکھ رہی تھیں
آج صبح بالاجی کے خیر مقدم میں یہ نغمہ گایا جا رہا تھا۔

بالاجی تیرا آنا مبارک ہووے

اور اس وقت عورتیں اپنے دلکش اور من بھانے سُروں میں گا رہی ہیں

بالاجی تیرا جانا مبارک ہووے

آنا بھی مبارک تھا اور جانا بھی مبارک ہے۔ آنے کے وقت بھی آنکھوں سے آنسو نکلے تھے۔ اور جانے کے وقت بھی نکل رہے ہیں۔ کل وہ مہمان کا خیر مقدم کرنے کے لئے آئے تھے۔ آج اسکی الوداع کہنے ہیں۔ انکا رنگ روپ بالکل یکساں ہے مگر اُن میں کتنا فرق ہے۔

منوالی جوگن

مادھوی پہلے ہی سے مُرجھائی ہوئی کلی تھی حسرت نے اُسے خاک میں ملا دیا۔ بیس سال کی تپسوی جوگن بنگئی۔ اُس غریب کی بھی کیا زندگی تھی کریا تو وہ لمیں کوئی آرزو پیدا ہی نہیں ہوئی یا ہوئی تو قسمت نے اسے پھولنے پھلنے نہ دیا۔ اسکا پریم عشق کا دریا تھا کتنا تھا اُس میں ایسا سیلاب آیا کہ زندگی کی آرزوئیں اور حسرتیں فنا ہو گئیں۔ اُس نے جوگنوں سے بستر بہت لئے اور علایق دنیا سے آزاد ہو گئی۔ دنیا انہیں

ارمانوں اور آرزوؤں کا دوسرا نام ہے جس نے انہیں گور حسرت میں دفن کر دیا۔ اسے دُنیا میں سمجھنا بھول ہے

اس پریم کے نشہ سے متوالی جوگن کو ایک جگہ قیام نہ تھا بوئے گل کی طرح دیس دیس پھرتی اور پریم کے شبد سُناتی پھرتی تھی۔ اُس کے زرد چہرہ پر گیروے رنگ کی کفنی بہت سہانی معلوم ہوتی تھی۔ یہ پریم کی مُورت دیکھکر لوگوں کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے جب وہ اپنی بین پر کوئی بھجن گانے لگتی تو سُننے والوں کے دل پریم اور انوراگ سے سرشار ہو جاتے تھے۔ اسکا ایک ایک شبد پریم رس میں ڈُوبا ہوتا تھا۔

متوالی جوگن کو بالاجی کے نام سے عشق تھا۔ وہ اپنے پدوں میں اکثر اُنہیں کی کیرت سُناتی تھی۔ جسدن سے اس نے جوگیا بھیس لیا اور لوک لاج کو پریم کے پیچھا ور کر دیا اُسی دن سے اُسکی زبان پر گویا سرستی بیٹھ گئیں۔ اُسکے رسیلے پد سُننے کو لوگ سینکڑوں کوس سے چلے آتے تھے جس طرح نبسی کی صدا سُنتے ہی گوپیاں گھروں سے بیقرار ہوکر نکل پڑتی تھیں اُسیطرح اس جوگن کی تان سنتے ہی انسانوں کا ایک دریا اُمڈ پڑتا اُسکے پد سُننا آنند کے پیالے پینا تھا۔

اس جوگن کو کسی نے ہنستے یا روتے نہیں دیکھا۔ اسے نہ کسی بات کا رنج تھا نہ کسی بات کی خوشی جس دل میں آرزوئیں نہ ہوں وہ کیوں ہنسے اور کیوں روئے۔ اسکا چہرہ آنند کی تصویر تھا۔ اُس پر نگاہ پڑتے ہی دیکھنے والوں کی آنکھیں پاک سُرور سے لبریز ہو جاتی تھیں۔

تمام شد